تعلیم و تربیت
نومبر 1997ء
قائدِ اعظمؒ کلاسک
نویں قسط
ایک زندہ تصنیف
مجاہدینِ آزادی
سب سے کم عمر چیمپئن
کھیلوں کی دنیا

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

47 واں سال آٹھواں شمارہ

بچوں کا محبوب رسالہ

مدیر اعلیٰ: عبدالسلام — ایڈمنسٹریٹر: ظہیر سلام — مدیر: سعید لخت

فرض ادا کرنا ہو گا

ایک ایسے مصیبت زدہ معصوم بچے کی کہانی جو اگر خرکاروں کے ہتھے چڑھ جاتا تو اس کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو جاتی۔ بچوں کے معروف ادیب کے قلم سے ---- آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

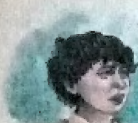

السلام علیکم و رحمتہ اللہ!

نومبر کا مہینا شاعرِ مشرق، حکیم الامت اور مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال کی ولادت کا مہینا ہے۔ علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے اور 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں وفات پائی۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے ہماری سوئی ہوئی قوم کو جگایا اور اسے خودی یعنی خود اعتمادی کا پیغام دیا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ انھیں جنت میں اونچے سے اونچا درجہ عطا فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کے کلام کو سمجھیں اور اس پر سچے دل سے عمل کریں۔

اس ماہ سے قلمی دوستی کے سلسلے آیئے دوست بنائیں کو چار رنگوں میں شائع کرنے کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی آپ کی خواہش پر کی گئی ہے۔ آیندہ سے آپ بلیک اینڈ وائیٹ کے بجائے رنگین تصاویر ارسال کریں۔ جن ساتھیوں نے بلیک اینڈ وائیٹ تصاویر بھیجی تھیں اور وہ شائع نہیں ہوئیں وہ بھی اب رنگین تصاویر ارسال کر دیں۔ لیکن یاد رہے کہ تصویر پاس پورٹ سائز کی ہو۔

نئے سال یعنی جنوری 1998ء سے ہم آپ کو ایک دم بہت ساری خوش خبریاں سنائیں گے۔ یعنی ایسی خوش خبریاں جن کو سن کر آپ خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے۔ اور آپ کو اپنا محبوب رسالہ پہلے سے بالکل نیا اور پہلے سے بھی دل کش لگے گا۔

ایک افسوس بھری خبر یہ ہے کہ بچوں کے بہت ہی اچھے اور مقبول شاعر زاہد الحسن زاہد 13 اکتوبر کو وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ تعلیم و تربیت میں آپ ان کی نظمیں پڑھتے رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ آپ بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔

سرورق: محمد کمال جگدال

نومبر 1997ء

قیمت فی [illegible] =/15 روپے

(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

اس شمارے میں

سالانہ قیمت: پاکستان میں: صرف رجسٹری کے ساتھ =/345 روپے — مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے — یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/790 روپے — امریکہ، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815-6278816-6361309-6361310

علامہ اقبالؒ کی یاد میں

حضرت اقبالؒ اے اقبال مند
تیرے پہلو میں تھا قلب درد مند
تو نے مردہ قوم کو گرما دیا
ڈھنگ جینے کا اسے سکھلا دیا
روح ہر دل میں نرالی پھونک دی
بخش دی ان کو انوکھی زندگی
چھا رہی تھیں ہر طرف تاریکیاں
تو نے شعروں سے کیا روشن جہاں
اپنے شعروں سے جگایا قوم کو
دین کا رستہ دکھایا قوم کو
تیری حکمت اور فراست کا صلہ
ہے عطیہ سرزمین پاک کا
فلسفہ اور شاعری تیرے ثمر
ساری دنیا پہ ہوا ان کا اثر
تیرا شاہین اور ترا لفظ خودی
عظمت ملّی کے عنوان جلی
مرتبہ تیرا بھلا سکتے نہیں
تجھ سا شاعر آج پا سکتے نہیں
مشرق و مغرب میں تیرا نام ہے
فیض تیری شاعری کا عام ہے
ہے دلوں میں تیرا اتنا احترام
سر جھکا دیتے ہیں سن کے تیرا نام
اے مجاہد قوم کے مرد جری
رحمتیں نازل ہوں تربت پہ تری

زاہد الحسن زاہد

سچا خواب

سیّد نظر زیدی

یہ پاکستان بننے سے بہت دن پہلے کی بات ہے۔ پنجاب کی ریاست نابھہ کا سکھ راجا اپنے محل کے جھروکے میں بیٹھا اپنی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کا جلوس دیکھ رہا تھا۔ سکھ اپنی اس کتاب کا بہت ادب کرتے ہیں۔ اس میں ان کے گرو بابا نانک کے ایسے شعر لکھے ہوئے ہیں جن میں انھوں نے بہت اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں اور ان اچھی باتوں میں یہ بھی ہے کہ عبادت صرف اللہ کی کرنی چاہیے۔ اسے توحید کا عقیدہ کہتے ہیں اور یہ ہم مسلمانوں کے دین اسلام کی جڑ بنیاد ہے۔

یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ یہ بات بابا گورو نانک نے دین اسلام ہی سے لی تھی۔ بابا جی اپنے زمانے کے بہت نیک اور بزرگ آدمی تھے۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو لوگوں کی اخلاقی حالت بہت خراب تھی۔ وہ دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ مسلمان، ہندو یا عیسائی ہیں لیکن مذہب کے حکموں پر عمل نہ کرتے تھے۔ جھوٹ، فریب، چوری چکاری، قتل و غارت گری وغیرہ جیسی برائیاں ان میں عام تھیں اور ان برائیوں سے بڑھ کر ایک برائی یہ تھی کہ مذہب کے نام پر آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کا خون بہاتے رہتے تھے۔

بابا گورو نانک پیدا تو ایک ہندو کے گھر ہوئے تھے۔ لیکن اللہ نے اپنی خاص رحمت سے انھیں نیکی اور سچائی کا راستہ دکھایا اور وہ اس کوشش میں لگ گئے کہ گناہوں میں پھنسے ہوئے اور آپس میں ناحق لڑنے جھگڑنے والے لوگ نیکی کے راستے پر چلیں اور ایک دوسرے سے نفرت کرنا چھوڑ دیں۔

بابا جی کی طرح کچھ اور بزرگ بھی نیکی کا یہ کام کر رہے تھے۔ ان میں بھگت کبیر کا نام بہت مشہور ہے۔ ان

لکھنے والے عالموں نے ان کوششوں کو بھگتی کی تحریک کہا ہے اور یہ بات مانی ہے کہ ان میں سب سے زیادہ کام یابی بابا گورو نانک کو حاصل ہوئی۔ ان کے ماننے والوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، لیکن ان کی تعلیم میں زیادہ باتیں دین اسلام ہی کی تھیں۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ آگے چل کر ان کے ماننے والوں نے اپنا ایک الگ فرقہ بنا لیا اور اسی طرح دوسروں سے لڑنے جھگڑنے لگے جس طرح ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ اس فرقے کے لوگوں کو سکھ کہا جاتا ہے۔ لڑنے جھگڑنے کے علاوہ ان میں ایک اور بڑی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ انھوں نے بابا جی کی تعلیم پر عمل کرنا بھی چھوڑ دیا۔

یہ خرابی دراصل بابا جی کے ان جا نشینوں کی وجہ سے پیدا ہوئی جو ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے اور کسی وجہ سے بابا جی کے ماننے والوں میں شامل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے آہستہ آہستہ توحید کے عقیدے سے دوری اختیار کر لی۔ ہندوؤں کے قریب ہو گئے اور مسلمانوں سے ایک طرح لڑائی چھیڑ دی۔

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں بابا گورو نانک کی جگہ سکھ اپنے دوسرے گوروؤں کی تعلیم پر زیادہ عمل کرتے تھے۔ انھوں نے ایک یہ بات اختیار کر لی تھی کہ اپنی مذہبی کتاب گرنتھ کو جسے وہ گرنتھ صاحب کہتے تھے۔ ایک طرح اسے پوجنا شروع کر دیا تھا۔ گوردواروں میں گرنتھ صاحب کو اونچی جگہ رکھا جاتا تھا۔ ایک گرنتھی یعنی سکھ عالم اسے مور چھل جھلتا رہتا تھا اور جو سکھ گوردواروں میں آتے تھے گرنتھ صاحب کو سجدہ کرتے تھے۔ بابا گورو نانک نے خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے سے روکا تھا۔ لیکن ان کی یہ بات بھلا دی گئی تھی اور ان کی کتاب کو ایک طرح بت بنا لیا گیا تھا۔

ریاست نابھہ میں خاص موقع پر گرنتھ صاحب کا جلوس بھی نکالا جاتا تھا۔ ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر اسے پالکی میں رکھا جاتا تھا اور سکھ گاتے بجاتے ہوئے جلوس کی شکل میں اس کے آگے پیچھے چلتے تھے۔ جس وقت نابھہ کا راجا گرنتھ صاحب کا جلوس دیکھ رہا تھا اس کے دربار کے شاعر اور طبیب حکیم غلام فرید بھی اس کے قریب بیٹھے تھے۔ جلوس دیکھتے دیکھتے راجا کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ حکیم صاحب کی طرف دیکھ کر بولا "یہ حکیم صاحب آپ دیکھ رہے ہیں ہم سکھ اپنی کتاب کی کس طرح عزت کرتے ہیں۔ ایک آپ مسلمان ہیں کہ اپنے قرآن کو میلے کچیلے جزدانوں میں لپیٹ کر بغلوں میں دبائے پھرتے ہیں"۔

راجا نے یہ بات ایسے لہجے میں کہی جس سے بہت حقارت ظاہر ہوتی تھی۔ اس کا مطلب شیخی بگھارنا ہی تھا۔ حکیم صاحب کو اس کی یہ بات بہت بری لگی۔ وہ راجا کی طرف دیکھ کر بولے۔ "مہاراج' شریف گھرانوں کی عورتیں معمولی لباس پہنتی ہیں' لیکن ان طوائفوں سے زیادہ معزز ہوتی ہیں جو بہت بڑھیا ریشمی لباس پہنتی ہیں"۔

حکیم صاحب کی یہ بات سن کر راجا کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ چلا کر بولا "کوئی ہے' اس شخص کو لے جاؤ اور جیل خانے کی کال کوٹھری میں ڈال دو۔"

راجا کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ بہت سے سپاہی وہاں آگئے اور حکیم صاحب کو گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے اور ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر جیل خانے کی اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کی ریاستوں کے راجا اور نواب خاصی خوف ناک چیز تھے۔ اگرچہ ان کی ریاستوں میں عدالتیں ہوتی تھیں جن میں مقدموں کے فیصلے کیے جاتے تھے' لیکن جن لوگوں سے یہ راجا نواب ناراض ہو جاتے تھے ان کا فیصلہ وہ خود ہی کرتے تھے اور وہ جو سزا سنا دیتے تھے وہ آخری ہوتی تھی۔ ان کے فیصلے بہت ظالمانہ ہوتے تھے۔

ایک راجا کے بارے میں یہ دل چسپ لطیفہ مشہور ہے کہ اپنی تاج پوشی کے جشن کے موقع پر اس نے قیدیوں کی سزا معاف کرنے یا کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ قیدی اس کے سامنے پیش کیے جاتے تھے اور وہ ان کا حال احوال پوچھ کر رہائی کا حکم دے دیتا تھا۔ ایک بہت بوڑھا قیدی اس کے سامنے آیا تو اس نے پوچھا "تم کتنے عرصے سے قید کاٹ رہے ہو؟"

قیدی نے جواب دیا "پچاس برس سے قید ہوں' مجھے مہاراج کے والد صاحب نے جیل بھیجا تھا"۔

قیدی کا جواب سن کر راجا کچھ دیر سوچتا رہا۔ لگتا تھا وہ قیدی پر مہربان ہو گیا ہے' لیکن توقع کے خلاف اسے رہا کرنے کا حکم دینے کے بجائے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اس بوڑھے کو اس کی کوٹھڑی میں بند کر دو۔ اسے ہمارے پتا جی نے قید کیا تھا۔ ہم چاہتے ہیں ان کی نشانی باقی رہے"۔

حکیم صاحب کو جیل بھیجنے کا مطلب تھا اب ان کی باقی زندگی کال کوٹھڑی ہی میں گزرے گی۔ لیکن اللہ کی شان نرالی ہے۔ انھوں نے قرآن پاک کی شان کا خیال کر کے راجا کو جواب دیا تھا اور اپنی جگہ خوش تھے کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا لہٰذا خدا میری مدد ضرور کرے گا۔ اور ایسا ہی ہوا بھی' جس دن انھیں جیل خانے میں بھیجا گیا تھا اسی رات منصور پور نام کے گاؤں میں رہنے والے ایک نیک دل شخص قاضی معزالدین صاحب نے خواب دیکھا' رسول کریم ﷺ اور آپ ؐ کے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ تشریف لائے ہیں۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اللہ کے رسول ؐ قاضی صاحب سے فرماتے ہیں ہم نماز پڑھیں گے تم اتنی دیر ہمارے گھوڑوں کی نگرانی کرو۔ نماز کے بعد ہم پٹیالہ جائیں گے۔ وہاں کے راجا نے ہمارے دوست حکیم غلام فرید کو قید کر دیا ہے اسے آزاد کرانا ہے۔

قاضی صاحب کو حکیم صاحب کے قید کر دیے جانے کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ خواب دیکھ کر ان کی آنکھ کھلی تو ان کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ یہ بات جانتے تھے کہ اگر کوئی رسول کریم ﷺ کو خواب میں دیکھے تو سچ مچ آپ ؐ ہی کی زیارت کرتا ہے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ حکیم صاحب لازمی طور پر رہا ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا بھی۔

صبح کے وقت جیل خانے کے محافظوں نے دیکھا' حکیم صاحب کی کوٹھڑی کا مضبوط دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے اور ان کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی اتری ہوئی ہیں۔ یہ عجیب ماجرا دیکھ کر ان کے تو ہوش اڑ گئے۔ انھوں نے خیال کیا راجا کو قیدی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے اور ہتھکڑیاں بیڑیاں اترنے کا حال معلوم ہو گا تو وہ یہی خیال کرے گا کہ ضرور محافظوں میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہے' انھوں نے فوراً راجا کو یہ خبر دی اور گڑگڑا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلایا۔

راجا کو پہلے تو یقین نہ آیا کہ جیل خانے کی کوٹھڑی کا مضبوط دروازہ آپ سے آپ کھل سکتا اور قیدی کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بغیر اتارے اتر سکتی ہیں' لیکن جب جیل خانے جا کر اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھا تو اسے یقین آگیا کہ غیب سے حکیم صاحب کی مدد ہوئی ہے۔ اس نے اسی وقت حکیم صاحب کی سزا معاف کر دی۔ اپنے فیصلے پر شرمندگی ظاہر کی اور انھیں ان کے عہدوں پر بحال کر دیا۔

یہ سچا واقعہ قاضی عبدالباقی قدسی صاحب نے رحمۃ للعالمین کے مصنف قاضی سلیمان سلمان منصور پوری صاحب کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

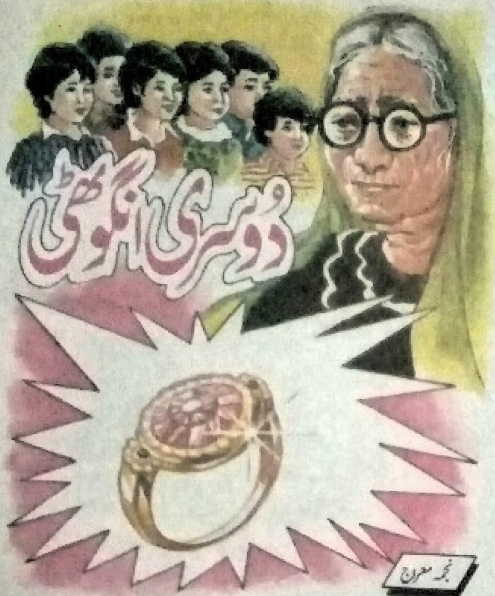

دوسری انگوٹھی

نجمہ معراج

آج اسکول میں چھٹی تھی۔ زوبیہ حسب معمول صبح سویرے اٹھی۔ نماز پڑھنے کے بعد ابو کے پاس چلی گئی۔

"ابو جان آج مجھے میری سہیلی رمیصا کے پاس چھوڑ آؤ۔ ہم سارا دن باتیں کریں گے اور کھیلیں گے۔ اگلے دن صبح سویرے مجھے لے آنا"۔

"چلو بیٹا ابھی چھوڑ آتا ہوں" ابو نے کہا۔ "ناشتا بھی وہاں ہی کر لینا۔ اس سے آپ دونوں کو اکٹھے رہنے کا مزید وقت مل سکے گا"۔

رمیصا کو اس کے ابو زوبیہ کے گھر چھوڑ آئے۔ زوبیہ اور رمیصا نے سارا دن خوب گپ شپ لگائی۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر انہوں نے گفت گو نہ کی ہو۔ کبھی ان کا موضوع ان کی استانیاں ہوتیں تو کبھی چھٹیوں کا کام، کبھی والدین کی ڈانٹ ڈپٹ تو کبھی اپنے بیتے دنوں کی یادیں۔ شام کو رمیصا کے گھر اس کی نانی اماں آئیں۔ نانی اماں کے ساتھ رمیصا کی خالہ کی بیٹیاں شائلہ اور رشدہ بھی آئیں۔ ہم سب نانی اماں کے پیچھے پڑ گئیں کہ اپنے بچپن کا کوئی واقعہ سنائیں۔ نانی اماں بولیں۔ "سب خاموشی سے بیٹھ جاؤ پھر میں آپ کو اپنے بچپن کا ایسا واقعہ سناتی ہوں جو بچپن سے شروع ہوا اور جوانی پر ختم ہوا"۔

"واہ اتنا لمبا واقعہ" زوبیہ نے خوش ہو کر کہا

"بیٹیوں ہمارا بچپن آپ سے کہیں اچھا تھا"۔ نانی اماں نے واقعہ سنانا شروع کیا۔ "بھولا بھالا زمانہ تھا۔ میرے ابا جان تو کھیتی باڑی کرتے تھے۔ لیکن میری سہیلی کے والد شہر میں لڑکیوں کے اسکول میں کلرک تھے۔ میری سہیلی کا نام عمرانی بی تھا۔ ہم دونوں سارا دن اکٹھے کھیلتے اور اکٹھے ہی پڑھتے تھے۔ ہمیں زیور پہننے کا بے انتہا شوق تھا۔ عید بقر عید یا کسی تقریب میں ہم اپنے خاندان کی بہوؤں کو زیور پہنے بڑی حسرت سے دیکھتے۔ خاص کر سونے کی انگوٹھیاں ہم دونوں کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ ہم بھی کبھی دھاگوں کے زیور بنانے کی کوشش کرتے تو کبھی کاغذوں کو زیورات کا روپ دینے کی۔ مگر اب تک ہماری ایسی کوئی کوشش کام یاب نہ ہوئی تھی اور اب ہم مسلسل سوچ رہے تھے کہ کس طرح زیور بنائے جا سکتے ہیں۔

ایک دن ہمارے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ ہم

نے ایک پانی والا پرانا سا ٹب نکلوا لیا۔ جو گھر کے کباڑ خانے میں پڑا ہوا تھا۔ اس میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور قدموں کی چاپ کے بغیر گھر سے ردی کاغذ اکٹھے کیے اور گھڑے میں ڈال دیئے پھر اسے اوپر سے ڈھانپ دیا"۔

رشدہ، شائلہ اور ریحا نانی اماں کی زیور بنانے کی یہ ترکیب بڑے غور سے سن رہی تھیں۔

"اسی دوران میں ہمارے کانوں میں اپنی دادی اماں، جو آنکھوں سے اندھی تھیں، کی آواز پڑی۔ اے عمر بی بی، ارے نصیب بی بی، کدھر دوڑ بھاگ رہی ہو۔ آرام سے بیٹھ کر اسکول کا کام کرو۔ نصیب بی بی کے تو پتا نہیں نصیب جل گئے ہیں جو اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا ہے اور سارا دن عمر بی بی سے کھیلتی رہتی ہے"۔

ریحا کی نانی نے اپنی دادی اماں کے لہجے میں جب یہ کہا تو سب بچوں نے قہقہہ لگایا۔

"نصیب جل گئے" سن کر میں دوڑ کر دادی اماں کے پاس گئی اور کہا کہ دادی اماں آپ تو مجھے بددعائیں دینے لگ گئیں۔ ہم تو تختیاں دھو رہے تھے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کیوں کہ کاغذ بھگونے سے پہلے ہم نے تختیاں دھوئی تھیں"۔

"اچھا بیٹا پڑھا کرو" دادی اماں نے یہ کہا اور خاموش ہو گئیں اور ہم پھر اپنے مشن میں جت گئے۔ چند دنوں بعد ہم نے کاغذ نکالے اور ہاون دستے کی مدد سے خوب اچھی طرح کوٹ کر یک جان کئے۔ پھر اس میں کاغذوں کے برابر گاچی ڈالی اور کوٹ کوٹ کر لئی سی بنائی۔ جب یہ لئی ذرا سخت ہوئی تو ہم نے اس سے مختلف قسم کے کئی زیور بنائے۔ مثلاً گلے میں ڈالنے کے لیے دو گلوبند، پاؤں میں ڈالنے کے لیے دو پازیب، ماتھے کے دو جھومر اور دو انگوٹھیاں۔ پھر ان کو خشک ہونے کے لیے رکھ دیا۔ جب وہ خشک ہو گئے تو ہماری پھوپھو جان نے چنگیروں کو لگانے کے لیے جو مختلف رنگ رکھے ہوئے تھے، ہم نے وہ تھوڑے تھوڑے لیے اور پانی میں حل کر کے گاچی اور کاغذوں کی لئی کے بنے ہوئے زیوروں پر لگا دیئے۔ رنگوں کی وجہ سے یہ زیور بہت بھلے لگنے لگے تھے۔ ہم انھیں ایسے احتیاط کے ساتھ چھوتے تھے جیسے وہ واقعی اصلی سونے کے ہوں۔

ہمارے ہمسایوں کی ایک چھوٹی سی بچی تھی جو بمشکل چل سکتی تھی۔ وہ لڑھکتی سنبھلتی ننھے ننھے قدم اٹھاتے ہوئے اپنی گڑیا لے کر ہمارے گھر آجاتی تھی۔ ہم سارا دن اس کی گڑیا سے کھیلتے۔ اسے گاچی کے بنے ہوئے زیور پہناتے۔ کبھی شرما شرما کر اور بڑوں سے چھپ کر خود بھی پہن کر دیکھتے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک میلہ لگتا تھا۔ اسے لوگ "بابے بوڑی والے کا میلہ" کہتے تھے۔ گاؤں کے تقریباً سب لوگ یہ میلہ دیکھنے جاتے تھے اور وہاں سے مختلف چیزیں خرید کر لاتے تھے۔ میرے ابا جان

تو کبھی بھی میلہ دیکھنے نہ جاتے تھے کیوں کہ اگر وہ جاتے تو پیچھے سے مویشی بھوکے مر جاتے۔ ان کے پیچھے انہیں چارہ ڈالنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ہماری امی جان پردہ دار خاتون تھیں۔ میلہ دیکھنا تو دور کی بات وہ کبھی گھر سے بھی باہر نہیں نکلتی تھیں۔

"نانی اماں پھر کیا ہوا؟" زوبیہ نے کہا

"ایک دن میری سہیلی عمرہ بی بی کے ابو اسے میلہ دکھانے لے گئے۔ وہ وہاں سے ایک بہت ہی خوب صورت انگوٹھی لے آئی۔ اس انگوٹھی میں فیروزی رنگ کا نگینہ لگا ہوا تھا۔ یہ انگوٹھی سونے کی تھی نہ چاندی کی مگر ہمیں یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ سونے اور چاندی کی انگوٹھیاں نہ تو ہمیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی ہمیں ان کی خواہش کرنی چاہیے البتہ یہ ہماری کانچ کی انگوٹھیوں سے ہزار درجے بہتر تھی۔ جب عمرہ بی بی نے مجھے انگوٹھی دکھائی تو میرا دل چاہا کہ اتنی پیاری انگوٹھی میرے پاس بھی آجائے۔

"عمرہ بی' اتنی پیاری انگوٹھی کہاں سے لی تو نے؟" میں نے پوچھا

"دادی اماں آپ عمرہ بی سے چھین لیتیں" شمائلہ جو ہمیشہ چھینا جھپٹی کے لیے تیار رہتی تھی' نے کہا۔

"نہیں بھئی' وہ تو اس کی انگوٹھی تھی میں کسی کے حق پر بھلا کیوں ڈاکہ ڈالتی" نانی اماں نے کہا۔

"آں' نانی اماں آگے کہانی سناؤ' یہ شمائلہ ایسے ہی بیچ میں بول پڑتی ہے" رشدہ نے کہا۔

"تو ہاں جب میں نے پوچھا کہ تو نے یہ انگوٹھی کہاں سے لی ہے تو عمرہ بی جلدی سے بولی "کل میں ابا جان کے ساتھ بابے بودی والے کا میلہ دیکھنے گئی تھی۔ ابو جان نے پوچھا بیٹا کیا لینا ہے تو میں نے کہا انگوٹھی لے دیں۔ انہوں نے مجھے یہ انگوٹھی لے دی۔

"عمرہ بی وہاں ایسی اور بھی انگوٹھیاں ہوں گی" میں نے پوچھا۔

"ہاں نصیب بی بی بہت سی انگوٹھیاں تھیں وہاں۔ کل ہم دونوں میلے میں جائیں گے اور آپ کے لیے بھی انگوٹھی لے آئیں گے" عمرہ بی بولی

"ہاں کل عورتوں کا میلہ ہے۔ بہت سی عورتیں جائیں گی۔ ہم بھی چلے جائیں گے۔ لیکن گھر بتا کے نہ جائیں گے۔ کیوں کہ پھر ہمارے گھر والے جانے نہیں دیں گے"۔

اگلے دن دس بجے میں نے اپنے دوپٹے کے پلو میں اپنے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے باندھے اور ہم دونوں چپکے سے گھر سے نکل پڑے۔ پھر میلے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہاں پہنچے تو میلے کا منظر دیکھ کر میں تو حیران ہی رہ گئی۔ ایک جگہ موت کا کنواں تھا' ایک طرف سرکس کے ٹکٹ فروخت ہو رہے تھے۔ مٹھائیوں کی بڑی بڑی مگر عارضی دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ڈھول کی تھاپ پر کچھ لوگ بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ مداری بندر اور ریچھ' سانپ اور نیولے' لڑکے اور لڑکے کے تماشے دکھا رہے تھے۔ بڑے بڑے جھولے اور چرخیاں لگی ہوئی تھیں۔ بجلی سے چلنے والی کاروں کے لیے بھی ایک جگہ مخصوص تھی۔ بچے ان میں سوار ہو کر خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مگر ہم نے نہ تو کوئی تماشا دیکھا اور نہ ہی جھولے لیے بلکہ جلدی جلدی اسی دکان سے انگوٹھی خریدی جس سے عمرہ بی نے اپنے ابو کے ساتھ خریدی تھی اور جلدی سے گھر کی طرف لوٹے"۔

سب بچے نانی اماں کی بچپن کی کہانی بڑے غور سے سن رہے تھے۔ اتنے سارے بچوں کی موجودگی میں اس طرح خاموشی تھی جیسے سب کو سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ نانی اماں نے اپنی کہانی شروع رکھتے ہوئے کہا "واپسی پر بہت دھوپ تھی اور ہم جلدی میں جب گھر سے نکلے تھے تو جوتے بھی نہیں پہن کر گئے تھے۔ تپتی ہوئی زمین پر چلنے سے ہمارے پاؤں سرخ ہو گئے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ابھی خون نکل آئے گا۔ ہمارے چہرے کی رنگت بھی ڈر کے مارے زرد ہو رہی تھی۔ راستے میں ہمارے ایک رشتے دار کے کھیت تھے۔ کھیت والے آدمی کو ہم چچا طفیل کہتے تھے۔ ہم وہاں سے گزرتے ہوئے اور زیادہ ڈر رہے تھے کہ اگر

ہمیں چچا طفیل نے دیکھ لیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ مگر آج شاید ہمارے سارے خوف سچ ثابت ہو رہے تھے۔ ابھی ہم چچا طفیل کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ وہ اچانک گندم کے کھیت سے باہر آئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں درانتی تھی۔ ہم اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے۔ لیکن چچا طفیل ہمیں ڈانٹنے کے بجائے اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے "مرن جوگیو' بودی والے کا میلہ ہی دیکھنا تھا تو گھر سے جوتیاں پہن کر آتیں۔ اب پاؤں جلا رہی ہو۔ گھاس کے اوپر اوپر چلو' اس طرح پاؤں کم جلیں گے"۔

چچا طفیل کی نقل اتارتے ہوئے نانی اماں کو جب ریسما نے دیکھا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی مگر باقی بچے خاموشی سے کہانی سننے میں مگن تھے لہٰذا نانی اماں نے اپنی کہانی جاری رکھی۔

"گھاس پر چلنے سے ہمیں کچھ فائدہ ہوا مگر پیروں میں اب بھی تکلیف موجود تھی۔ راستے میں ایک دو جگہ پانی آیا۔ ہم نے اس میں پاؤں اور ہاتھ منہ ٹھنڈے کیے اور پانی پیا۔ پھر اپنی منزل کی طرف جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔ ہم چاہ رہے تھے کہ ایک لمحے سے بھی پہلے گھر پہنچ جائیں۔ پھر بھی ہم ظہر کی اذان سے ذرا پہلے گھر پہنچے۔ میری امی جان کی آواز باہر آ رہی تھی۔

"پتا نہیں اماں جی آج نصیب بی بی اپنی سہیلی کے ساتھ کہاں چلی گئی۔ ابھی تک نہیں آئی"۔

میں یہ سن کر اور سہم گئی کہ اب میری خیر نہیں' خوب پٹائی ہو گی۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اس لیے لنگڑا

کر پھولا نہیں سما رہی تھی۔ لیکن امی جان نے لوگوں سے بھی یہ بات چھپانے کی تمام کوشش کرنے لگیں۔ مجھے دیکھ کر امی جان بولیں "بیٹا الٹی کی تھی۔ ابھی تو تمہارے بچپنے میں شادی ہو رہی ہے"۔

ہم بہن بھائی ان سے کوئی چیز نہیں چھپاتے تھے لہٰذا میں نے امی جان کو سارا واقعہ سنایا اور انگوٹھی بھی دکھا دی۔ امی جان بولیں "بیٹا بتا کر جاتیں اور جوتے پہن کر جاتیں تو میں اس قدر پریشان نہ ہوتی۔ چلو اب کھانا کھاؤ اور لیٹ جاؤ میں آپ کے پاؤں پر مہندی لگاتی ہوں تاکہ چھالوں میں کچھ ٹھنڈک پڑے"۔

میں یہ سوچتے ہوئے نہ جانے کب سو گئی کہ ماں کتنی عظیم چیز ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ امی جان میری خوب پٹائی کریں گی۔ لیکن دو تین دن تک میرے چھالوں پر مہندی لگی رہی۔ پھر میں بھی بچپنے کے کھیل بھول گئی۔

وقت گزرتا گیا مہینے اور سال کے پہیے گھومتے رہے ہم کرتے پتہ بھی نہ چلا کہ آنکھ جھپکنے میں بچپن گزر گیا۔ اب ہم دونوں جوان ہو چکی تھیں، میں بھی اور میری سہیلی عذرا بی بی بھی۔ ہماری زندگی کا دوسرا دور شروع ہو چکا تھا۔ اب ہم اپنے اپنے جہیز کے لیے تکیوں پر کڑھائی کرتے، کروشیے سے رومال بناتے، چادریں اور بیڈ شیٹ۔

ایک روز امی جان نے کہا "اپنی سہیلیوں کو بلا لو اور گھر کا کام بھی جلدی جلدی کر لو۔ آج آپ کی خالہ آپ کی منگنی کرنے آئیں گی"۔

اس وقت تک میرا دل خوشی سے معمور تھا کہ میری شادی ہو گی اور میں دلہن بن کر اپنی خالہ کے گھر جاؤں گی جو یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے اور پھر جب اپنی امی سے ملنے یہاں آیا کروں گی تو خوب سیر کیا کروں گی۔ اور پھر ایک دن ایسا آیا جب مجھے ایک رنگین پایوں والے اونچے سے پلنگ پر بٹھا دیا گیا اور سب لڑکیاں میرے اردگرد جمع ہو گئیں۔ خالہ جان نے بسم اللہ پڑھ کر مجھے انگوٹھی پہنائی۔ میری سہیلی عذرا بی بی جو ایک لڈو پکڑ کر میرے پاس کھڑی تھی، اس نے تھوڑا سا لڈو توڑ کر میرے منہ میں ڈالا۔ اور میرے اوپر سرخ دوپٹہ ڈال دیا۔

میں مسلسل روئے جا رہی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے شرم سے میری گردن زمین سے جا لگی ہو۔ میری سہیلی عذرا بی بی کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ "نصیب بی بی اب انگوٹھی پہننے پر رو رہی ہو؟ وہ دن یاد کرو جب انگوٹھی کے لیے دو میل کا پیدل ننگے پاؤں سفر کیا تھا اور پاؤں کے چھالے کئی دنوں تک صحیح نہیں ہوئے تھے"۔

عذرا بی بی باتیں کرتی رہیں اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نہ جانے وہ خوب صورت بچپن کہاں کھو گیا۔ جس میں انگوٹھی پہننے کی خوشی بھی شامل تھی۔ اب تو انگوٹھی ایک بھاری ذمہ داری کی نشانی ہے۔ بہن، بھائیوں اور والدین سے دور جانے کے بعد گھر کو سنبھالنے، خاوند اور رشتہ داروں کے حقوق پورے کرنے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری۔ یہ انگوٹھی تو والدین کی لاج کے لیے ہر دکھ سکھ سہہ کر رہنے کی نشانی ہے۔

بچپن کی انگوٹھی کی نسبت یہ انگوٹھی کہیں زیادہ قیمتی اور خوب صورت تھی۔ لیکن اس بچپن کی انگوٹھی کی جو خوشی تھی وہ اس کی کہاں۔ اس کے ساتھ تو بھاری ذمہ داریاں وابستہ ہو گئی تھیں۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا

اختیار یہ آواز نکلی "ہائے کتنا حسین تھا وہ بچپن جو بیت گیا۔ وہ معصوم سے کھیل' وہ مٹی کے زیور' کاغذ کی کشتیاں' جھولے' سہیلیوں کے گھر جانا' وہ گڑیا کی شادی کرنا' ریت کے گھروندے بنانا۔ جیسے جیسے میرے دل میں یہ باتیں آرہی تھیں آنسوؤں کے گرنے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر پاس کھڑی میری چھوٹی سی بھتیجی منال اپنی توتلی آواز میں بولی "پھوپھو جان' چپ کرو۔ آپ اس انگوٹھی کی وجہ سے رو رہی ہیں جو کل آپ نے خود ہی مجھے دی تھی' یہ لے لو۔"

ایک نظر میں نے اس انگوٹھی کو دیکھا جو میرے بچپن کی نشانی تھی اور اب میری بھتیجی کی ننھی سی انگلی میں تھی۔ میں نے منال کو پیار سے اپنی گود میں لے لیا۔ اور اس کی انگوٹھی کو دیکھنے لگی جس سے نہ جانے کیوں میرے دل کو کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ میرے آنسو تھم گئے۔ دل کی بے چینی قدرے کم ہوئی مگر افسردگی ابھی تک باقی تھی۔

سب مہمان چلے گئے۔ میں کافی دیر تک اپنی بھتیجی کو گود میں لیے افسردہ بیٹھی رہی اور سوچتی رہی کہ بچپن کتنا حسین تھا جو کسی صورت لوٹ نہیں سکتا۔ جس میں کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ کسی رشتے کا بندھن نہ تھا۔ نہ جھولوں پہ پابندی تھی اور نہ گڑیا سے کھیلنے سے کوئی روکتا تھا۔ کتنی معصوم خواہشیں تھیں۔ کس قدر کم قیمت مگر انمول انگوٹھیاں تھیں کہ جن کے عوض سوائے خوش ہونے کے اور کوئی ذمہ داری نہ تھی" میں یہ سوچ رہی تھی کہ اتنے میں امی جان کی آواز آئی۔

"اچھا نصیب بی بی' خدا آپ کے نصیب اچھے کرے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کرنے کی توفیق دے۔ اس قدر افسردہ کیوں ہوتی ہو۔ سب لڑکیوں کا مقدر یہی ہوتا ہے۔ اس کو اپنی خوش قسمتی جانو اور خوشی خوشی اپنی شادی کی تیاری کرو۔ آپ کی خالہ بھی آپ کی امی ہیں۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ اچھی ہیں۔ وہ آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ پیار کریں گی۔ یہ کہہ کر امی جان نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا۔ اور میں زار و قطار رونے لگی۔ آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ پتا نہیں آنکھوں میں آج اتنا پانی کہاں سے آگیا تھا۔

زوبیہ' رمیصا اور رشدہ کو شاید نانی اماں کے اس وقت زار و قطار رونے کی وجہ معلوم ہو گئی تھی۔ اسی لیے تو ان کی آنکھیں بھی یہ واقعہ سنتے ہوئے نم ناک ہو گئی تھیں۔ البتہ باقی بچے اس بات پر حیران تھے کہ نانی اماں کو اتنی اچھی' اتنی مہنگی انگوٹھی ملنے پر آخر رونا کیوں آگیا تھا۔ بچے اس بات کی وضاحت چاہتے تھے مگر رات کافی بیت چکی تھی اس لیے رمیصا کی امی نے سب کو سونے کا حکم سنا دیا۔ یوں بچے اپنے ذہن میں ابھرنے والے ایک سوال کا جواب نانی اماں سے پوچھے بغیر بستروں پر سونے کے لیے چلے گئے۔

زوبیہ نے اگلے دن صبح گھر آکر اپنی امی کو یہ کہانی سنائی تو زوبیہ کی امی نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا "ہاں بیٹی' بچپن کی انگوٹھیاں اس دوسری انگوٹھی سے واقعی بہت دل قریب اور انمول ہوتی ہیں"۔

ہاشو کی حجامت

بنت رضا

اسکول میں سہ ماہی امتحانوں کے بعد تین روز کی چھٹیاں ہوئیں۔ ننھا ہاشم تو ابھی نرسری ہی میں جاتا تھا' اس لیے اس کا کوئی امتحان تو نہ ہوا' مگر عاصم اور قاسم کے ساتھ اسے بھی چھٹیاں ضرور مل گئیں۔ تینوں بھائی ایک ہی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ عاصم بھائی تیسری جماعت میں' قاسم بھائی چوتھی میں اور ہاشو اسی اسکول کی نرسری میں۔

آج جب مس ناہید نے جماعت میں آکر بتایا کہ انہیں اگلے تین دن کے لیے چھٹیاں ہیں' تو باقی سب بچوں کے ساتھ ہاشم بھی ایک دم خوش ہو گیا۔ "آہا تین چھٹیاں! بہت مزا آئے گا' میں تو خوب مزے کروں گا۔ قاسم بھائی کی بڑی والی سرخ پتنگ اڑاؤں گا اور عاصم بھائی کے ساتھ مینڈک بھی پکڑنے جاؤں گا' اور اگر ابو سیر کرانے لے گئے۔" وہ چھٹیوں کے منصوبے بنانے لگا۔

"اور ہاں! جس جس کے بال بڑھے ہوئے ہیں' وہ چھٹیوں کے بعد بال ترشوا کر آئے" مس کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "مس میرے بال لمبے ہیں کیا؟" عامر نے کھڑے ہو کر حسب عادت پوچھا۔ عامر کو ہر بات پوچھنے کی عادت تھی۔ خاص کر وہ بات جس کا جواب اسے پہلے ہی معلوم ہوتا تھا۔

"نہیں عامر' تمہارے بال درست ہیں' تمہیں ترشوانے کی ضرورت نہیں" مس نے اس کی طرف غور سے دیکھ کر کہا پھر باقی بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں "ہاں مگر عمران' اسد اور ہاشم تم تینوں کو حجامت بنوانے کی ضرورت ہے۔ ہاشم کے بال تو بہت زیادہ لمبے ہو رہے ہیں۔"

مس نے بتایا تو ہاشم نے عمران اور اسد کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا "اوہو! تو اب بال بھی کٹوانے پڑیں گے چھٹیوں میں" اس نے دل میں کہا۔

اسی وقت چھٹی کی گھنٹی بج گئی اور چند لمحوں بعد ہی قاسم بھائی اسے لینے آگئے۔ پھر وہ خوشی سے جھومتا بھائی کا ہاتھ تھامے اسکول کے بیرونی دروازے کی طرف آ گیا جہاں عاصم اور ابو ان کا انتظار کر رہے تھے۔

اگلے روز بھی تو چھٹی تھی مگر ہاشم کی آنکھ جلد ہی کھل گئی۔ قاسم اور عاصم تو ابھی سو رہے تھے' وہ بور سا ہو کر ابو کے پاس آ گیا۔ "ابا

"میرا اچھا جاگ گیا" ابو اسے دیکھ کر بولے۔

وہ رضائی میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ہاشم ان کو سلام کر کے ان کے ساتھ رضائی میں گھس گیا۔ "ابو جان! امی اماں کہاں ہیں؟" اس نے امی کو کمرے میں موجود نہ پا کر پوچھا۔

"وہ چائے بنا رہی ہیں" ابو نے جواب دیا۔

"ابو ہمیں اسکول سے تین چھٹیاں ہیں" وہ اشتیاق سے اٹھ بیٹھا "ابو آپ کو بھی چھٹیاں ہیں؟" اس نے بھولپن سے پوچھا۔

"نہیں جناب یہ مزے تو صرف آپ کے ہی ہیں!" ابو اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔

"ابو امی اسکول تو نہیں جاتیں!"

ابو نے سر ہاں میں ہلایا۔

"تو پھر وہ دفتر بھی تو نہیں جاتیں" وہ پھر بولا۔

"بیٹے کیونکہ وہ گھر پہ رہ کر ہم سب کے لیے کام کرتی ہیں، کھانا بناتی ہیں، گھر کو صاف ستھرا رکھتی ہیں، ہماری ضرورت کی چیزوں کا انتظام کرتی ہیں نا!" ابو نے بتایا۔

"جی" ہاشم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو بیٹے گھر کا کام بھی دفتر کے کام اور اسکول کے کام جتنا ہی اہم ہے، اگر امی دفتر یا اسکول نہیں جاتیں تو وہ گھر میں سب کے لیے بہت ضروری کام کرتی ہیں" ابو نے بہت اطمینان سے سمجھایا۔

اسی وقت امی ابو کے لیے چائے لے کر آ گئیں۔ "ہاشم تم اٹھ گئے، چلو بیٹے پہلے منہ ہاتھ دھو لو" وہ اسے اٹھاتے ہوئے بولیں۔

منہ ہاتھ دھو کر ہاشم دوبارہ ابو کے پاس آیا۔ امی نے اپنی چٹیا کھولی اور بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔ "امی کے بال کتنے لمبے ہیں!" ہاشم نے امی کو دیکھ کر سوچا پھر یک دم اسے امی کے لمبے بالوں سے کچھ یاد آیا "امی وہ..."

مگر امی اچانک چونک کر بولیں "اوہو میں تو دلیہ پکا رہی تھی، کہیں دلیہ جل ہی نہ رہا ہو" پھر چٹیا گوندھتی ہوئیں تیزی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

ابو اسے اخبار میں سے بچوں کے صفحے پر بنی تصویریں دکھانے لگے۔

اس وقت عاصم اور قاسم بھائی جاگے اور قریب آ بیٹھے۔

"امی نے دلیہ پکایا ہے" ہاشم نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے بھائیوں کو اطلاع دی۔

"او ویری گڈ" قاسم بھائی نے خوش ہو کر تالی بجائی۔

دلیہ ان تینوں بھائیوں کی پسندیدہ چیز تھی۔ عاصم فوراً دلیہ کھانے والے چھوٹے پیالے لے کر امی کے پاس باورچی خانے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تینوں ان کے ساتھ بیٹھے مزے سے دلیہ کھا رہے تھے۔ دلیہ کھاتے کھاتے ہاشم کو اپنے پیالے میں کوئی باریک سی چیز نظر آئی۔ اس نے پیالے میں انگلی پھیر کر دیکھا تو وہ چیز اکھڑ کر اوپر آگئی۔ وہ ایک بال تھا۔ [illegible] اور یقیناً اس وقت [illegible] آگیا [illegible] کھانا [illegible] لے منہ میں ڈالا۔ "اوہو" بال باہر نکالنا اپنے منہ میں جا کر بہت زیادہ اچھا محسوس نہ ہوا۔ اس نے جلدی سے اسے نگلنے کی کوشش کی تو حلق میں پھنسنے لگا۔ وہ کھانسا اور دلیہ باہر اگل دیا۔

"اوہو! کیا ہوا؟" امی نے اسے کندھوں سے پکڑتے ہوئے تشویش سے کہا۔

"امی بال" وہ مشکل سے بولا۔

امی نے اس کے منہ میں انگلی ڈال کر بال باہر نکالا۔ عاصم اور قاسم بھی اس کے قریب آ کر اس کے حلق میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگے۔ "امی میں کہہ رہا تھا تمہیں ٹنڈ کروا کر آنا" ہاشم کو پھر سے اپنے بال یاد آ گئے۔

"بیٹے کلی کر کے آؤ" امی اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں۔

"امی جی! میں کہہ رہا تھا تمہیں ٹنڈ کروا کر آنا" ہاشم نے ناشتے کی میز پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے دوہرایا۔

"اچھا بیٹا! میں نے سن لیا ہے۔ آج تمہاری پہلی چھٹی ہے، ٹنڈ کروانے کے لیے ابھی کافی وقت ہے" امی نے ہاشم کے آگے سے میز صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے ٹنڈ تو تم دونوں کی بھی ہونے والی ہے" انہوں نے عاصم اور قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"ابو! امی کو تو پروا ہی نہیں، کتنا ضروری ہے بال کٹوانا" امی کا جواب سن کر ہاشم نے قدرے مایوسی سے سوچا۔

ناشتے کے بعد تینوں بھائی باغ میں آ گئے۔ "بھائی مینڈک پکڑنے چلیں؟" ہاشم نے عاصم سے رازداری سے پوچھا۔

"خبردار، بالکل نہیں، ابو نے سختی سے منع کیا ہے!" قاسم رعب سے بولا تو وہ دونوں ہی سٹ پٹا گئے۔ پھر قاسم اپنی پتنگ لے آیا۔ عاصم اور ہاشم بھی اس کے کھیل میں شامل ہو گئے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد عاصم بے زار ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے پتنگ بازی سے کچھ خاص لگاؤ نہ تھا۔ پھر اسے گھاس کاٹنے والی مشین نظر آئی تو وہ گھاس کاٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاشم کو بھی عاصم کا یہ کھیل پتنگ بازی سے زیادہ دل چسپ لگا۔ وہ بھی عاصم کے پاس آ گیا اور دونوں مل کر مشین چلانے لگے۔ "بھائی! اس سے بال بھی کٹ سکتے ہیں؟" ہاشم نے اچانک مشین کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"شاید" عاصم نے پرسوچ انداز میں جواب دیا۔

"ہاں! ہاں! تم دونوں کے بال تو اسی سے کاٹیں گے!" قاسم پتنگ چھوڑ کر ہنستا ہوا ان کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ تینوں اکٹھے مل کر مشین چلانے لگے۔ یوں مل کر گھاس کاٹنے میں بہت مزا آ رہا تھا۔ قاسم نے اپنی پتنگ کی ڈور توڑ کر پتنگ مشین کے ہینڈل سے باندھ دی۔ اب جو انھوں نے مشین چلائی تو پتنگ بھی مشین کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ تینوں کو یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوا اور وہ بلاوجہ ہی ہنسنے لگے۔ عاصم نے ہاشم کو گدگدی کی تو وہ ہنستے ہنستے نڈھال سا ہو کر گھاس پر گر گیا۔ تازہ تازہ کٹی ہوئی نرم گھاس اس کے منہ پر چپک گئی۔ یہ دیکھ کر قاسم اور عاصم اور بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ بھائیوں کو یوں ہنستا دیکھ کر ہاشم زمین پر لیٹا ہی قہقہے لگانے لگا۔ اچانک اس کی نظر گھاس کاٹنے والی مشین کے بڑے بڑے گول بلیڈوں پر پڑی۔ اس کی ہنسی کو ایک دم بریک لگ گئے۔ وہ کچھ سہم گیا۔ اسی وقت عاصم کو اونچے اسٹول پر رکھی باڑ کاٹنے والی بڑی قینچی پڑی نظر آئی۔ وہ دوڑ کر اسے اٹھا لایا اور بلا مقصد ہی ہوا میں قینچی چلاتے ہوئے بولا "ہاشو! آؤ تمھاری کٹنگ کر دوں!"

اتنی بڑی قینچی! اس سے تو اس کی گردن بھی کٹ جائے گی۔ ہاشم کچھ اور سہم گیا اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ گیا۔ "عاصم! واپس رکھو اسے، معلوم نہیں ابو نے منع کیا تھا" قاسم نے ہاشم کی پشت پر سے گھاس اتارتے ہوئے اسے ڈانٹا۔ پھر تینوں اندر آ گئے۔

دوپہر کو ابو کھانا کھانے گھر آئے "ابو، بال کس سے کاٹتے ہیں؟" ہاشم نے ان سے پوچھا۔

"قینچی سے!" انھوں نے پیار سے جواب دیا۔

"اور بھی کسی چیز سے کاٹتے ہیں؟" ہاشم نے اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے پھر سوال کیا۔

"ہاں ایک مشین ہوتی ہے جس سے گردن کے بال کاٹتے ہیں، ایسے ایسے" ابو نے اپنی انگلیوں کو اس کی گردن پر مشینی قینچی کی طرح پھیرتے ہوئے بتایا۔

"جیسے گھاس کاٹنے کی مشین ہوتی ہے" ہاشم کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! بالکل ویسی ہی مشین!" ابو ہاشم کے خوف سے بے خبر اس کی بات پر مسکرا دیے۔

"کل آپ کو چھٹی ہے، آپ تینوں کو بال ترشوانے کے لیے لے جائیے" امی نے ابو کو یاد دلایا۔

"بالکل، کل صبح ان شاء اللہ تعالیٰ یہ کام کریں گے" ابو نے مسکرا کر کہا۔ اسی وقت قاسم کی نظر ہاشم پر پڑی۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔

"بھائی! میں بال نہیں کٹواؤں گا" ہاشم نے قاسم سے کہا۔ وہ تینوں دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کو لیٹے تھے۔ ابو واپس دفتر جا چکے تھے اور امی اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔

"وہ کیوں؟" قاسم نے ہاشم کی بات سن کر پوچھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے" اس نے معصومیت سے جواب دیا

"اچھا نہ کٹوانا، اب تو سو جاؤ" قاسم ساتھ لیٹے چھوٹے بھائی کو پیار کرتے ہوئے بولا۔

"بھائی کہانی سنائیں" ہاشم نے فرمائش کی۔

"اچھا کون سی سنو گے۔ سنہری دم والے خرگوش کی سناؤں"

"جی ہاں" ہاشم نے خوش ہو کر کہا اور پھر کہانی سنتے سنتے گہری نیند سو گیا۔

"عاصم یار سنو" ہاشم سو گیا تو قاسم نے کھڑکی میں چڑھے عاصم

کو پکارا۔

"کیا ہے؟" وہ خفگی سے بولا اسے لنگور کی طرح کھڑکی کی سلاخوں سے لٹکنے میں بہت مزا آتا تھا۔

"ادھر نیچے آؤ ایک کام کرتے ہیں" قاسم بستر سے اٹھتے ہوئے بولا تو عاصم کو احساس ہوا کہ اس کے ذہن میں یقیناً کوئی قابل قبول منصوبہ ہے۔ وہ آرام سے قاسم کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

شام کو جب امی ان کے کمرے میں آئیں تو عاصم بہت پُرسکون انداز میں قینچی ہاتھ میں لیے پرانا اخبار کاٹ رہا تھا جب کہ ہاشم اور قاسم سو رہے تھے۔ امی کی نظر ہاشم کے تکیے پر بکھرے بالوں پر پڑی' ساتھ ہی انھیں باقی سارے بستر پر بھی جگہ جگہ کٹے ہوئے بال نظر آئے۔ وہ لپک کر آگے بڑھیں تو دیکھا کہ ہاشم کے سر کے بال بڑی بے دردی سے ایسے کاٹے گئے تھے جیسے سارے سر میں جگہ جگہ گھاس کی کیاری لگائی گئی ہو۔ قاسم اور عاصم کی حجامت بھی کچھ ایسی ہی مہارت سے بنائی گئی تھی۔ وہ حیران کھڑی کچھ دیر یہ منظر دیکھتی رہیں۔ پھر انھوں نے عاصم کو پکارا۔ "جی امی جان!" وہ عجیب شان بے نیازی سے منہ اوپر اٹھا کر بولا۔

"تم لوگوں نے اپنے بال کاٹے ہیں؟" وہ خفگی سے اونچی آواز میں بولیں

"جی امی میں نے تو کٹنگ کے بعد نہا بھی لیا ہے" عاصم نے فخر سے اترا کر بتایا۔

"مگر کیوں؟ کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟" انھوں نے الجھن سے پوچھا۔

"امی' ہاشو ڈر رہا تھا نا' کٹنگ کروانے سے۔ اسی لیے ہم نے سوتے میں اس کی کٹنگ کر دی" قاسم نے بہت سمجھ داری سے جواب دیا' وہ بھی اب جاگ چکا تھا۔

"ہاں اور ہاشم کی حجامت کے بعد تم دونوں نے اپنے بالوں کا بھی ستیاناس کر لیا"۔ امی نے غصے سے کہا تو قاسم کو حالات کی سنگینی کا کچھ کچھ اندازہ ہوا۔

"کیوں امی کیا ٹھیک نہیں کٹے؟" اس نے دبی ہوئی زبان میں پوچھا۔

"بات بال ٹھیک یا خراب کٹنے کی نہیں' اگر بال کاٹنے میں کسی کے قینچی لگ جاتی تو!" وہ عاصم کے ہاتھ سے قینچی لیتے ہوئے بولیں۔

"امی مگر کٹے تو ٹھیک ہیں ناں؟" عاصم نے کمال معصومیت سے قاسم کا سوال دہرایا

"امی!" امی کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی ہاشم جاگ گیا اور آکر امی سے چمٹ گیا۔ ہاشم اپنے اس اجڑے کٹے گھاس کے میدان جیسے سر کے ساتھ بہت ہی مزاحیہ لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر امی کو اپنی مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو گئی۔

"بالکل مسخرے لگ رہے ہو تم تینوں' ذرا آئینے میں اپنی صورتیں تو دیکھو" امی قاسم کا ہاتھ پکڑ کر اسے سنگھار میز کے سامنے لے آئیں۔ "دیکھو تم بھی دیکھو آگے ہو کر" انھوں نے عاصم سے کہا' وہ ابھی ان کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

"امی! امی یہ کیا ہے؟" ہاشم نے اب اپنے تکیے پر پڑے بال دیکھے تو ایک دم ہی سہم کر رونے لگا۔

"کچھ بھی نہیں ہاشو تم سو رہے تھے نا تو ہم نے تمھاری کٹنگ کر دی ہے" قاسم نے پاس آکر بہت اطمینان سے بتایا۔

"کچھ بھی نہیں' ذرا اس کے بالوں کا حشر تو دیکھو یوں لگتا ہے جیسے کھاد ڈالنے کے لیے کھیت تیار کیا گیا ہو' میں پوچھتی ہوں اگر یہ قینچی سے زخمی ہو جاتا تو!" امی کو دوبارہ غصہ آنے لگا۔

امی کی بات سن کر ہاشم دوبارہ ڈر گیا۔ "واقعی اگر میری گردن کٹ جاتی تو! میں تو سو رہا تھا۔ بال کٹنے سے خون بھی نکلا ہو گا' مجھے تو پتا بھی نہیں چلا" یہ سوچ کر وہ مزید پریشان ہو گیا۔

"اچھا ہاشم! اب رونا بند کرو' آؤ میں تمھیں نہلا دوں اور جاؤ قاسم ماسی سے کہو کہ بستر کی چادر تبدیل کرے" وہ ہاشم کو غسل خانے میں لے جاتے ہوئے بولیں۔

جب امی نے نہلانے کے لیے ہاشم کے سر پر پانی ڈالا تو اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو خون بال کٹنے سے نکلا ہے وہ اسے بہتے دیکھے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ اسے کٹے ہوئے بالوں میں کچھ خاص درد محسوس نہ ہوا۔

ابو رات کھانے پر گھر لوٹے۔ امی نے انھیں سارا واقعہ سنایا۔ دیکھو بیٹے' تمھیں کاغذ کاٹنے کے لیے تو قینچی استعمال کرنے کی

اجازت ہے مگر بال کاٹنے کے لئے نہیں۔ حجام کو اس بات میں مہارت حاصل ہو گئی ہے کہ بال کاٹنے میں کسی کو ذرا ڈر نہ لگے۔ یہ کام تم بچوں کا ہرگز نہیں۔ سمجھ گئے!" انہوں نے سمجھانے کے بعد تینوں بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر بہت پیار سے سمجھایا۔ "اب ہم صبح جا کر حجام سے آپ تینوں کے بال ٹھیک سے کٹوائیں گے" ابو ہاشم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"ابو جان! میں بال نہیں کٹواؤں گا" ہاشم بولا۔

"ارے نہیں بیٹا! ایسے بال لے کر اسکول جاؤ گے تو سب دوست ہنسیں گے" ابو نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کا دل کچھ بیٹھ سا گیا۔

"کیا کروں، بال نہ کٹوائے تو سب دوست ہنسیں گے مگر درد بھی تو ہو گا اور خون بھی تو نکلے گا" رات بستر پر لیٹے لیٹے اسی فکر میں نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ابو اسے ایک گندے اور تنگ سے کمرے میں لے گئے ہیں، وہاں ایک بڑا سا دیو نما شخص ہاتھ میں باڑ کاٹنے والی قینچی لیے کھڑا ہے۔ ہاشم نے چند ہی دن پہلے اسی طرح کا خوف ناک شخص ایک انگریزی فلم میں دیکھا تھا۔ اس شخص نے لپک کر اسے پکڑا اور دونوں پیروں سے جکڑ کر الٹا لٹکا دیا اور لگا کچ کچ قینچی چلانے۔ دہشت کے مارے اس سے تو چیخا بھی نہ جا رہا تھا۔ پھر جونہی اس شخص نے جھک کر گھاس کاٹنے والی مشین اٹھانا چاہی، ہاشم نے پوری قوت سے اپنے دانت اس کے بازو میں گاڑ دیے۔ اس خوف ناک شخص نے جھنجھلا کر اسے چھوڑ دیا اور وہ سرپٹ دروازے کی طرف بھاگا مگر اچانک کسی چیز سے ٹکرا کر گر گیا۔

"ارے ہاشو! کیوں میرے پیٹ میں ٹانگیں مار رہے ہو؟" عاصم کی آواز نے اسے جگا دیا۔

صبح ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ لیٹا عاصم اسے خفگی سے گھور رہا تھا۔

"شکر ہے یہ خواب ہی تھا" ہاشم نے دھڑکتے دل سے سوچا مگر وہ ابھی تک سہما ہوا تھا۔

ناشتہ کرنے کے کچھ دیر بعد وہ تینوں کھیلتے رہے پھر ابو نے انہیں تیار کیا اور انہیں لے کر بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ "اچھا آئس کریم تو بال کٹوانے کے بعد کھائیں گے نا ہم" ہاشم کو خاموش دیکھ کر ابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس میں تو دیر لگے گی" عاصم نے معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

آئس کریم کے نام سے ہاشو کا خیال بھی کچھ بٹ گیا۔ ابو نے گاڑی ایک صاف ستھری دکان کے آگے روک دی۔ دکان کی شفاف کھڑکیوں اور دروازے پر دھوپ روکنے والا سرخ اور سفید شیڈ لگا ہوا تھا۔ وہ ہلکے رنگ کی دو سیڑھیاں عبور کر کے ایک بہت روشن اور وسیع مستطیل کمرے میں آئے۔ دونوں طرف کی

دیواروں پر بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے' جن کے آگے شیشے کے شیلف لگے تھے۔ ہر آئینے کے مقابل' فرش اور دیواروں کی طرح ہلکے سلیٹی رنگ کی گدیلی کرسیاں رکھی تھیں۔ ہاشم اشتیاق سے آنکھیں کھولے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ صبح صبح دکان پر اور کوئی گاہک نہ تھا۔ اتنے میں ایک پیارے سے چہرے والے بڑے میاں آئے۔ "جی فرمایئے کیا سب بچوں کو حجامت بنوانا ہے؟" انھوں نے ان تینوں کو شفقت سے دیکھتے ہوئے ابو سے پوچھا۔

ابو نے دبی ہوئی آواز میں انھیں کچھ واضح کیا تو سن کر وہ بولے "آپ بے فکر ہو جائیں جناب' ابھی سب کچھ درست ہو جائے گا"۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے دو کاریگروں کو آواز دی جو بڑی چابک دستی سے آکر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ننھے میاں' آپ ادھر آجایئے"۔ بڑے میاں ہاشم کو ایک قدرے اونچی مگر چھوٹی کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولے۔ "ہاں مگر پہلے یہ اپنا اتنا پیارا سویٹر تو اتار لیں" انھوں نے ہاشم کا سفید بٹنوں والا سرخ سویٹر ابو کو تھما دیا۔ پھر انھوں نے اسے سنہرے رنگ کا ایک بیضوی ڈبہ دکھایا۔ اس کے ڈھکن پر ایک گڑیا لگی تھی۔ بڑے میاں نے ڈبے کے ساتھ لگی چابی بھری تو گڑیا ڈبے سے نکلنے والی موسیقی کے ساتھ ساتھ گھومنے لگی۔ ہاشم حیرت سے بڑی بڑی آنکھیں کھولے اسے دیکھتا رہا۔

"بیٹے! سر تھوڑا سا آگے کو جھکاؤ" بڑے میاں نے اسے متوجہ کیا۔ پھر نجانے انھوں نے اس کی گردن پر کیا پھیرا کہ وہ ہنسنے لگا۔

"کیوں بھئی ہنستے کیوں ہو؟" انھوں نے مسکرا کر سوال کیا۔

"گدگدی ہوتی ہے" وہ پھر ہنسا۔

"ہاشو! یہ وہی مشینی قینچی ہے' گھاس کاٹنے والی مشین جیسی!" ابو نے بڑے میاں کے ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی چمکدار چیز کی طرف اشارہ کیا تو ہاشم مسکرایا۔ جب ہاشم کے بال کٹ گئے تو ایک بہت نرم برش سے فالتو بال جھاڑ دیے گئے۔ ہاشم نے دیکھا اس کے بال اب بہت چھوٹے ہو گئے تھے۔ پھر بڑے میاں نے گڑیا والا سنہری ڈبہ کھولا۔ اس میں سے انھوں نے ایک نہایت نرم سی مخمل کی گدی کی مدد سے اس کی گردن پہ پوڈر لگا دیا۔ ہاشم اور بھی خوش ہوا۔ اتنے میں اس کی نظر بھائیوں پر پڑی۔ ان دونوں کے سر پر کوئی بال نہ تھا۔ ان کی "ٹنڈیں" چمک رہی تھیں۔

"جناب اس کے علاوہ اب ان کا اور کوئی ہیر اسٹائل نہیں بن سکتا تھا" ایک کاریگر نے ہنستے ہوئے ابو کو بتایا۔

"کچھ پریشانی کی کوئی بات نہیں! آج کل تو آپ لوگ اسکول اونی ٹوپیاں پہن کر جاتے ہوں گے اور پھر یہ بال ایک دو ہفتوں میں دوبارہ آجائیں گے" عاصم اور قاسم کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر بڑے میاں نے بتایا تو ہاشم کو کچھ تسلی ہو گئی۔

گھر واپسی پر ہاشم کار میں بہت مطمئن سا بیٹھا اپنی آئس کریم کھا رہا تھا۔ ظاہر ہے مس نادیہ کے کہنے کے مطابق اس کی ٹنڈ ہو گئی تھی "عمران اور راشد نے بھی بال ترشوانے لیے ہوں گے اور پھر اگر ان کی گردن پر بھی وہ چلبلی قینچی پھیری گئی ہو گی تو انھیں بھی تو گدگدی ہوئی ہو گی" یہ سوچ کر وہ مسکرا دیا۔ لیکن ایک بات کا اسے یقین تھا۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی گھومنے والی گڑیا والا سنہری ڈبہ نہ دیکھا ہو گا۔

ڈاکٹر رضوان ثاقب

ایک رات میری لائبریری میں کتابوں کا ایک کیڑا پروانے سے شکایت کر رہا تھا کہ میں نے اپنا گھر کتابوں کے ورقوں کو بنایا ہوا ہے مگر مجھے پھر بھی آج تک زندگی کی حقیقت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہتے ہیں کہ علم روشنی ہوتی ہے مگر میرے اردگرد اندھیرا کیوں پھیلا ہوا ہے۔

پروانے نے کہا "بھئی کتابی کیڑے! آپ کو یہ نکتہ کسی کتاب میں نہیں مل سکتا۔"

"کون سا نکتہ؟" کتابی کیڑے نے حیران ہو کر پوچھا۔

پروانے نے جواب دیا "زندگی جس چیز سے باقی رہتی ہے اس کا نام تپش ہے۔ تپش یا حرارت ایسی چیز ہے جو بے جان بال و پر کو بھی زندگی کی مشکلوں سے لڑنا سکھا دیتی ہے"۔

کتابی کیڑے کی یہ مختصر کہانی ہمیں زندہ تصنیف نے فارسی میں سنائی تھی۔ ہم نے اس کا اردو ترجمہ کر کے آپ کو سنا دی۔ کرمِ کتابی یا کتابی کیڑا اس کیڑے کو کہتے ہیں جو کتابوں میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے اوراق کے اوراق چاٹ جاتا ہے۔ عام طور پر اس شخص کو بھی کتابی کیڑا کہا جاتا ہے جو ہر وقت کتابیں ہی پڑھتا رہتا ہے۔ اور ان کتابوں سے حاصل ہونے والے علم سے کوئی عملی کام سر انجام نہیں دیتا۔

دنیا میں کم ہی ایسے لوگ ہوں گے جن کو اپنے اعلیٰ خیالات اور بامقصد شاعری کی وجہ سے اتنی شہرت نصیب ہوئی ہو جتنی اس زندہ تصنیف کے حصے میں آئی۔ اس کی زندگی میں ہی اس کی شاعری کا چرچا دنیا کے کونے کونے میں پھیل گیا۔ لوگ اس کے شعر پڑھ کر دور دور سے اس سے ملنے کے لیے آتے اور اس کی گفت گو سے فیض یاب ہوتے۔ اس کے ملاقاتیوں میں موچی گیٹ کے کباب فروشوں سے لے کر اسلامی دنیا کے عالم اور فاضل تک شامل ہوتے تھے۔ وہ ہر شخص سے اس کی ذہنی سطح کے مطابق بات کرتی۔ لیکن یہ گفت گو ایسی پر مغز ہوتی کہ ہر ملاقات میں کئی نئی کتابیں لکھنے کا مواد موجود ہوتا۔

یہ زندہ تصنیف بڑی حاضر دماغ اور خوش طبع تھی۔ ایک روز اس کے پاس پنجاب اسمبلی کے اسپیکر چودھری شہاب الدین، جن کی رنگت خاصی سیاہ تھی، بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے کہا "چودھری صاحب، آپ سچے مسلمان ہیں" چودھری صاحب نے حیران ہو کر پوچھا "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

اس نے کہا "مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے اور الحمدللہ آپ کا ظاہر و باطن یکساں ہے"۔

کھانے پینے میں یہ زندہ تصنیف بعض خاص چیزیں ضرور پسند کرتی تھی مگر طبیعت میں ایسی سادگی تھی کہ جو کچھ مل جاتا خاموشی سے کھا لیتی اور کبھی کھانے میں نقص نہ نکالتی۔ البتہ نمکین کشمیری چائے بڑی رغبت سے پیتی تھی۔ پھلوں میں اسے آم بہت پسند تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ شدید بیمار تھی اس کے معالج حکیم نابینا نے آموں کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی مگر اس کے اصرار پر انہوں نے روزانہ ایک آم کھانے کی اجازت دے دی۔ ایک دن مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر انقلاب لاہور اس کی عیادت کے لیے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میز پر خاصا بڑا کوئی ایک کلو وزنی آم پلیٹ میں رکھا ہے۔ سالک صاحب نے کہا "یہ تو بد پرہیزی ہے" زندہ تصنیف کہنے لگی "حکیم صاحب

نے ایک آم کھانے کی اجازت تو دے رکھی ہے اور یہ بہرحال ایک ہی آم تو ہے"۔

علی گڑھ کے طلبہ میں تلاش اور تحقیق کا مادہ شروع سے رہا ہے۔ یہ زندہ تصنیف جب علی گڑھ کالج گئی تو ایک طالب علم نے اس سے سوال کیا "جناب آپ نے فلسفہ پڑھا ہے اور فلسفہ ہر شے کا ثبوت مانگتا ہے۔ آپ نے فلسفے کی رو سے اللہ کے وجود کو کیسے مانا"۔

اس نے برجستہ کہا "یہ صحیح ہے کہ میں نے فلسفہ پڑھا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ فلسفہ ہر شے کے وجود کے لیے ثبوت مانگتا ہے لیکن میں نے اللہ کے وجود کو اس لیے مانا کہ محمدؐ نے کہا اللہ ہے اور محمدؐ کے متعلق غیر بھی یہ نہیں کہتے کہ اس نے کبھی جھوٹ بولا ہے۔

سقراط نے کہا تھا کہ ہر پتھر میں ایک مورت موجود ہوتی ہے مگر جب تک کوئی سنگ تراش پتھر کی تراش خراش نہ کرے وہ مورت ظاہر نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر شخص کے اندر دماغ موجود ہوتا ہے جب تک وہ اس کو علم کی روشنی سے منور نہ کرلے وہ کبھی بھی عظیم انسان نہیں بن سکتا۔ جس طرح ایک پتھر کو سنگ تراش کاٹ کاٹ کر اتنا حسین اور خوب صورت بنا دیتا ہے کہ وہ عام پتھروں کے بجائے خاص پتھروں میں شمار ہونے لگتا ہے اور کم زور عقیدے کے لوگ اس کی پوجا کرنے لگتے ہیں۔ اور بہت سارے لوگ ایسے خوب صورت پتھروں کو بھاری قیمت ادا کرکے خرید لاتے ہیں تاکہ انھیں اپنے گھر کی زینت بنا سکیں۔ اسی طرح ایک شاگرد کو اگر کوئی قابل استاد مل جائے تو وہ شاگرد پھر عام شاگرد نہیں رہتا بلکہ وہ قوم کا سرمایہ بن جاتا ہے اور معاشرے میں عام انسانوں سے اس کی قدر و قیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ زندہ تصنیف کو بھی خوش قسمتی سے ایسا ہی قابل استاد ملا تھا۔ جس نے اسے عام شاگرد سے ایک زندہ تصنیف بنا دیا تھا۔

یہ سید میر حسن تھے۔ انھوں نے اس خام سونے کو کندن بنا دیا۔ پھر یہ زندہ تصنیف علم کی منزلیں طے کرتی چلی گئی۔ جب یہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے یورپ سے لوٹی اور اس نے علم کے جلوے دکھائے تو اس زمانے کی حکومت نے اس کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے سر کے خطاب سے نوازنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر سر کا خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ جب تک میرے محترم استاد مولانا سید میر حسن صاحب کہ جنھوں نے مجھے گم نام پتھر سے یاقوت بنایا' کو خطاب سے نہ نوازا جائے میں ہرگز یہ خطاب قبول نہیں کروں گا۔ حکومت کی طرف سے عذر کیا گیا کہ یہ تو ہم مانتے ہیں کہ سید میر حسن صاحب بہت بڑے عالم اور فاضل ہیں لیکن انھوں نے تو آج تک کوئی کتاب ہی نہیں لکھی پھر بھلا ہم انھیں سر کا خطاب کیسے دے سکتے ہیں؟

"ان کی زندہ تصنیف میں ہوں" اس نے کہا۔

حکومت نے اس زندہ تصنیف کا اعتراف کیا اور اس کے استاد سید میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دیا۔ اس کے بعد اس زندہ تصنیف نے سر کا خطاب قبول کیا۔

یقیناً آپ اس زندہ تصنیف کا نام جانتے ہوں گے۔ جی ہاں' شاعر مشرق' حکیم الامت' مفکر اسلام' علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال کے نام کو بھلا کون نہیں جانتا۔ آپ ملت اسلامیہ کے وہ عظیم راہ نما اور ملی شاعر تھے جنھوں نے دو قومی نظریے کے فروغ اور تحریک پاکستان کی فکر کو عام کیا۔ سوئی ہوئی قوم کو جگایا۔ نوجوان نسل کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق راہ نمائی کی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان پر علامہ اقبال کے بے شمار احسانات ہیں۔

آپ 9 نومبر 1877ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ نور محمد اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن بہت نیک اور غور و فکر کرنے کے عادی تھے۔ اس لئے بڑے ذہین اور دانا تھے۔ ان کی دانائی کی باتیں دور دور تک مشہور تھیں۔ شمس العلما مولانا میر حسن نے انھیں "ان پڑھ فلسفی" کا خطاب دے رکھا تھا۔

علامہ اقبال دو بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ آپ نے پرائمری' مڈل اور میٹرک کے امتحانوں

میں وظیفہ حاصل کیا۔ ایف اے کا امتحان اسکاچ مشن کالج سیال کوٹ سے پاس کیا۔ پھر لاہور کی عظیم اور قدیم درس گاہ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں سے بی اے کے امتحان میں سونے کے دو تمغے حاصل کیے۔ 1899ء میں ایم اے (فلسفہ) کا امتحان بھی امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اگست 1905ء میں آپ لندن گئے اور تین سال وہاں گزارے۔ فلسفے میں اعلیٰ امتحان کیمبرج (لندن) اور میونخ (جرمنی) کی یونی ورسٹیوں سے پاس کیے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

آپ کی شاعری قوم کے درد سے بھری ہوئی ہے۔ آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے والہانہ محبت تھی اور اللہ تعالیٰ سے بہت عشق تھا۔ آپ کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ بچوں کے لئے آپ نے بہت خوب صورت نظمیں لکھی ہیں۔ آپ کی ایک نظم ہمدردی' جو آپ نے بچوں کے لئے لکھی تھی' کا ایک شعر ہے:

ہیں وہی لوگ جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

آپ کی عظمت کا ایک راز یہ ہے کہ آپ نے خودی کو بلند کیا اور خودی نے آپ کو بلند کر دیا۔ خودی کو بلند کرنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے اس حقیقت کو جاننا اور ماننا ضروری ہے کہ ساری مخلوق کا خالق' رازق' پروردگار' مالک اور حاکم صرف اور صرف اللہ ہے اور اس کی تمام مخلوق میں انسان سب سے افضل ہے۔ اس بات کو سمجھنا اور اس کے مطابق خودداری کی زندگی گزارنا خودی ہے۔ لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔ اس کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکائے۔ اللہ کی عبادت پورے خشوع اور خضوع کے ساتھ بجا لانا اور خود اپنی عزت کرنا ہی خودی کو بلند کرنا ہے۔ جو شخص ان معنوں میں اپنی خودی کو بلند کرتا ہے اللہ اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ اور اس پر خوب انعام و اکرام کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے اس مشہور شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے' بتا تیری رضا کیا ہے

خودی بلند ہو جائے تو انسان اپنے آپ کو پہچاننے والا اور خدا کو جاننے والا بن جاتا ہے۔ ایسے انسان کو عارف اور مرد کامل بھی کہتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو پہچان لے تو وہ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے نہ اس کو اپنا حاجت روا سمجھتا ہے اور نہ ہی اس سے خوف کھاتا ہے۔ کیوں کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا نہ تو اسے کوئی شخص کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی نقصان۔ وہ چوں کہ اپنے آپ کو صرف اور صرف اللہ کا بندہ سمجھتا ہے' اس لئے وہ کسی اور کا بندہ بن سکتا ہے نہ محکوم۔ وہ خوددار اور نیک کردار بن جاتا ہے۔ اس میں آزادی کا شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ اور وہ آزاد رہنا چاہتا ہے۔

علامہ اقبال بہت عظیم انسان تھے۔ آپ نے خودی کا درس برصغیر کے مسلمانوں کو اس وقت دیا جب وہ انگریزوں کے غلام تھے۔ غلامی میں قوم مردہ ہو جاتی ہے۔ اس کی خودی کمزور اور پست ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس

میں آزادی کا جذبہ بھی کم زور ہو جاتا ہے۔ حکم ران اس قوم کے تعلیمی نظام کو اس طرح بنا دیتے ہیں کہ اس کا معیار تعلیم پست سے پست تر ہوتا جائے۔ قوم کے نوجوانوں میں آزادی کی امنگ پیدا ہی نہ ہو' بلکہ وہ غلامی کے عادی بن جائیں۔

انگریزوں نے چوں کہ حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے وہ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں سے زیادہ خوف زدہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں کی خودی بلند ہو گئی تو ان میں غلامی کی زنجیریں توڑنے اور آزادی حاصل کرنے کا ولولہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ان پر حکومت کرنا دشوار ہو گا۔ اس خوف کی وجہ سے انگریزوں نے مسلمانوں کی خودی کو تہس نہس کرنے کی خاطر انہیں ہندوؤں کا محکوم بنانے کا منصوبہ بنایا۔ انگریزوں نے ہندوؤں کو تجارتی اور صنعتی آسانیاں دے کر خوب دولت مند بنا دیا۔ وہ مسلمانوں کے بجائے زیادہ تر ملازمتیں بھی ہندوؤں کو ہی دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں مالی لحاظ سے بہت کم زور ہو گئے۔ تعلیم' تجارت اور صنعت میں بھی ان سے بہت پیچھے رہ گئے۔ ہندوؤں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کو تجارت کرنے' کارخانے لگانے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔

اس طرح انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر مسلمانوں پر ترقی کے سارے راستے بند کر دیئے۔ غریبی کی وجہ سے مسلمان والدین اپنے بچوں کو تعلیم بھی نہیں دلا سکتے تھے۔ بہت کم گھرانے ایسے تھے جو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا سکتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں میں خواندگی کی شرح ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہو گئی۔ اس نازک دور میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان میں انگریزوں اور ہندوؤں کی محکومی اور غلامی سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے اپنی خودی کو بلند کرنے کا درس دیا۔

علامہ اقبال جہاں ایک بلند پایہ مفکر اور شاعر تھے وہاں آپ کے دل میں امت مسلمہ کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ سے اپنے ہم وطن مسلمانوں کی غریبی' ناخواندگی اور محکومی دیکھی نہ گئی۔ آپ نے درد دل کے ساتھ سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگانے اور خود شناس بنانے کے لئے بڑی زوردار نظمیں لکھیں۔ ان نظموں کا مسلمانوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ چناں چہ انھوں نے انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی محکومی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اس مقصد کے لئے ایک آزاد خود مختار وطن حاصل کرنے کی تحریک چلائی جسے تحریک پاکستان کہتے ہیں۔

1930ء میں علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس (الہ آباد) میں اپنا مشہور خطبہ پڑھا۔ اس میں آپ نے پہلی مرتبہ پاکستان کا مطالبہ کیا۔ اس خطبے کا سارے ملک میں زبردست چرچا ہوا اور مسلمانوں نے ایک زبان ہو کر پاکستان کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں بچوں اور بڑوں کی زبان پر یہ نعرے تھے۔

لے کے رہیں گے پاکستان/ بن کے رہے گا پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔۔۔ لا الہ الا اللہ

اس تحریک کو کام یاب کرنے کے لئے حضرت علامہ اقبال نے قائداعظم محمد علی جناح کو لندن سے بلایا اور مسلم لیگ کی راہ نمائی کرنے پر آمادہ کیا۔ قائداعظم کی شمولیت سے تحریک پاکستان روز بروز زور پکڑتی گئی۔ آخرکار ہندو اور انگریز دونوں پاکستان کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو گئے۔ اس تحریک کے بانی علامہ اقبال اور حقیقی راہ نما حضرت قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ آپ کا یہ عظیم کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آپ نے 21 اپریل 1938ء کو وفات پائی۔ آپ کا مقبرہ لاہور کی بادشاہی مسجد کے سائے میں ہے۔

آپ کی شاعری کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں بانگ درا اور بال جبریل بہت مشہور ہیں۔ آپ کی انقلابی شاعری آج بھی مسلمانوں کو خودی کو بلند کرنے اور آزادی کی حفاظت کرنے کا درس دیتی ہے۔ لازوال خدمات اور بامقصد شاعری کی بنا پر آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر عبد الرؤف

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں

فضول اور بے تکی باتیں

ہمارا آج کا موضوع ہے "فضول اور بے تکی باتیں" اس اہم موضوع کی وضاحت رسالت مآب آنحضور حضرت محمد ﷺ کی اس مبارک حدیث سے ہوتی ہے۔

"بہترین بات وہ ہے جو مختصر اور معقول ہو"۔

بات خواہ مسجد میں ہو رہی ہو یا مدرسے میں' مجلس شوریٰ میں ہو رہی ہو یا گلی بازار میں' گھر کے اندر ہو رہی ہو یا دوستوں کے حلقہ میں... اس کا مختصر اور بامعنی ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس سے اس کے حسن اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر یہ بقول قرآن مجید "گدھے کی آواز" دکھائی دیتی ہے۔ بے معنی گفت گو سے مخلوق خدا کے کان چاٹنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔

فضول اور بے تکی باتوں کو عام کرنے میں اکثر و بیشتر ان اداروں نے زہریلا کردار ادا کیا ہے۔

(1) ان مسجدوں نے جن کے کرتا دھرتا جاہل مولوی ہیں (2) ان اخباروں نے جن کا کام سنسنی پھیلانا ہے (3) ان فلموں نے جن میں صرف ماجھے ساجھے کام کرتے ہیں اور جو صرف جاہلوں کے لیے تیار ہوتی ہیں (4) ان عوامی' ملی اور انتظامی اداروں نے جن میں دولت اور سفارش کی بنا پر نالائق افراد اقتدار اور قیادت کی کرسی پر خواہ مخواہ براجمان ہو گئے ہیں۔ ایسے بے وقوف افراد اور اداروں نے بے تکے' فضول اور بے معنی شور و غوغا سے معاشرے کو یوں بھر دیا ہے کہ اب کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

اس دنیا اور آخرت میں کام یابی کے لیے ضروری ہے کہ ہم فضول' سطحی اور بے تکی باتوں سے پرہیز کریں اور اپنے منہ اور زبان کی یوں تربیت کریں کہ یہ جب بھی کھلیں تو ان سے "گدھے کی آواز" نکلنے کے بجائے کام کی معقول باتوں کی مہک ہی آئے۔

ناقابلِ یقین منظر

نعیم بلوچ

آج موسم بہت اچھا تھا۔ دھوپ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ میں پروگرام کے مطابق صبح صبح ہی کھیتوں میں پہنچ گیا۔ مجھے آج ہل چلانا تھا۔ زمین کو گندم کی بوائی کے لئے تیار کرنا تھا۔

میں اگرچہ ایک عام کسان ہوں اور ٹریکٹر نہیں خرید سکتا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ زمین کی زرخیزی اور کام میں لگن کی بدولت میرا کنبہ کبھی بھوکا نہیں سویا۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی امید ہے کہ آئندہ چند برسوں میں میرے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ قسطوں پر ٹریکٹر لے سکوں گا۔ خیر یہ تو مستقبل کی بات ہے 'ابھی تو میرے لیے بیلوں کی جوڑی ہی میرا ٹریکٹر ہے۔ بگا اور لنڈا' یہ میرے قیمتی اور پیارے بیلوں کے نام ہیں۔ بگا' سفید بیل کا نام اور دوسرے بیل کی دم کٹی ہوئی ہے اس لئے اسے لنڈا کہتے ہیں۔

میں نے اپنے بیل کھیتوں ہی میں رکھنے کا انتظام کیا ہوا ہے۔ وہاں دو کمرے اور ایک جھونپڑی نما چھپر ڈال رکھا ہے۔ کبھی وہاں میرا بڑا بیٹا سو جاتا ہے اور کبھی میں۔ میرا بیٹا اسکول پڑھنے جاتا ہے اس لئے صبح کے وقت میں کھیتوں میں اکیلا ہوتا ہوں۔

میں سورج نکلتے ہی زمین میں ہل چلانا شروع کر دیتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کئی پرندے میری اور بیلوں کی تنہائی دور کرنے آ جاتے تھے۔ ان میں جنگلی الو' کالی چڑی' عام گھریلو چڑیاں ہوتیں۔ اور کبھی کبھار دو چار فاختائیں بھی آ جاتیں۔ مگر زیادہ تر جنگلی الیاں ہی ہوتیں۔ اس دن معلوم نہیں کیا خاص بات تھی۔ چاروں قسم کے پرندے نظر آ رہے تھے۔ میں ہل چلا رہا تھا جب کہ الیاں اور چڑیاں زمین سے نکلنے والی سنڈیوں کو بڑی پھرتی سے شکار کر رہی تھیں۔ باقی پرندے بھی ہل چلائی ہوئی زمین میں کچھ نہ کچھ چگ رہے تھے۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد میں نے کچھ لڑکوں کو اپنے کھیتوں کی طرف آتے دیکھا۔ ان کے لباس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ گاؤں کے لڑکے نہیں لگتے تھے۔ قریب آئے تو میں نے انہیں پہچان لیا۔ یہ چودھری نثار کے مہمان تھے۔ شہر سے آئے تھے۔

ایک لڑکے کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ یہ بندوق چھوٹی تھی۔ چھرے والی 'ذرا مشکل سا نام تھا اس کا' ہاں یاد آیا ائرگن' یہ لڑکے اس سے چھوٹے موٹے پرندے مارتے پھرتے تھے۔ اب جب انہوں نے میرے کھیت کا رخ کیا تو میں سمجھ گیا یہ کیا کرنے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کو میرے کھیت میں کئی ایک پرندے نظر آئے تھے۔ اور وہ ان کا شکار کرنے آ رہے تھے۔

ان لڑکوں کے ساتھ چودھری نثار کا بیٹا نذیر بھی تھا۔ دوسرے دو لڑکے اس کے مہمان تھے۔ انہوں نے چست سی پتلونیں چڑھائی ہوئی تھیں۔ ویسے یہ انگریزی لباس انہیں بہت خوب تھا۔

ابھی وہ میرے کھیت سے کچھ فاصلے ہی پر تھے کہ حویلی سے ہمارا کتا ٹیپو ان کی طرف دوڑا۔ ان میں سے ایک لڑکے نے شور مچایا تو ائرگن والے نے جھٹ سے بندوق سیدھی کی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی لبلبی دبا دی۔

پھر ٹیپو کی بائیں ٹانگ پر لگا اور وہ "چاؤں چاؤں" کرتا واپس پلٹ گیا۔ اس کو یوں لپکا ہوتے دیکھ کر وہ سب بہت خوش

ہوئے اور قہقہے لگانے لگے۔ جب کہ مجھے ان پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ لیکن میں انہیں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ چودھری نثار کا تو گاؤں کے بڑے آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ میرے جیسا عام کسان تو اس کے بچوں سے بھی ڈرتا تھا۔ لیکن وہ قریب آئے تو میں نے چودھری نثار کے بیٹے سے کہا:

"نذیر پتر! اپنے مہمانوں کو سمجھاؤ کہ وہ پالتو جانوروں کا شکار تو نہ کریں۔"

"چاچا یعقوب، تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے انہوں نے تمہارے کتے کو کارتوس مار دیا ہو۔ یہ تو ائرگن ہے۔ اس سے بھلا کتے کا کیا بگڑا ہوگا؟"

میں نے سوچا کہ اسے مزید کچھ کہا تو یہ بدتمیزی پر اتر آئے گا۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ وہ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک نے ائرگن اٹھائی اور منڈیر پر بیٹھی کالی چڑی کو نشانہ بنانے لگا۔ میں فوراً بولا: "بابو جی! کالی چڑی تو حرام ہوتی ہے۔ اسے مار کر کیا ملے گا تمہیں؟"

"آپ کو اس سے کیا؟ میں جس کو چاہوں شکار کروں...... یہ کالی چڑی تو تمہاری پالتو نہیں!"

اس کا لہجہ بڑا ہی گستاخانہ تھا۔ میرا بیٹا اگر مجھے یوں جواب دیتا تو میں تھپڑ مار کر اس کا منہ دوسری طرف کر دیتا۔ لیکن وہ تو چودھریوں کا مہمان تھا اور شہری بابو ہونے کی وجہ سے مغرور بھی۔ میں سخت حیران تھا کہ پڑھ لکھ کر تو آدمی کو بااخلاق ہونا چاہئے۔ معلوم نہیں یہ لڑکا کیوں بداخلاق ہے؟

جلد ہی میری حیرت غصے میں بدل گئی جب اس کے اس جواب پر دوسرے لڑکے ہنسنے لگے۔ میں شرمندہ سا ہو کر چپ ہو گیا۔

اس لڑکے نے کالی چڑی کو نشانہ باندھا اور لبلبی دبا دی۔ مگر اس کا نشانہ بری طرح خطا ہوا۔ چڑی کہیں اور تھی اور چھرا کہیں اور سے گزرا تھا۔ کالی چڑی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا بھی گوارہ نہ کیا۔

"تم بہت نکمے ہو عرفان! لاؤ ادھر دو ائرگن، میں دکھاتا ہوں تمہیں!" دوسرے شہری لڑکے نے کہا۔ مگر اس موقع پر نذیر نے کہا:

"ذرا دھیان سے نعمان! ورنہ چاچا یعقوب مذاق اڑائے گا ہمارا۔"

اس لڑکے نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور نشانہ باندھنے لگا۔ میں دل پر پاؤں رکھے بیلوں کو ہانکتے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے لبلبی دبائی تو چڑی اڑ کر دور جا بیٹھی۔ چھرا چڑی کے قریب ہی لگا تھا۔ میں نے مٹی اڑتے دیکھی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "بھئی اس بابو کا نشانہ کچھ اچھا ہے، اس نے چڑی کو کم از کم اڑا تو دیا!"

میرے اس تبصرے پر وہ بہت بدمزہ ہوا۔ اس نے غصے میں آ کر مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھایا اور چڑی پر دے مارا۔ چڑی مزے سے اڑتی ہوئی دور ایک درخت کی طرف چلی گئی۔ پہلے شکار سے ناکامی کے بعد انہوں نے اب ایک فاختہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میں اپنے کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے یہ دیکھ نہ سکا کہ فاختہ کا کیا انجام ہوا ہے۔ لیکن جب نشانہ لگانے والے کا مذاق اڑتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ فاختہ بھی بچ گئی ہے۔

پرندوں نے بھی ان کی پرواہ کی اور ان کی تعداد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ غالباً وہ بھی جان گئے تھے کہ یہ اناڑی شکاری ہیں۔ میں بھی اب ان کی طرف زیادہ متوجہ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ان کی طرف سے "وہ مارا" کا نعرہ سنائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے ایک لالی کو زخمی کر ڈالا ہے اور وہ تڑپ رہی ہے۔ نشانہ لگانے والا لڑکا دیوانہ وار زخمی پرندے کی طرف بھاگا۔ وہ جوش میں میرے بیل "بگے" کے قریب سے گزرا تو بگے کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اپنی لمبی دم زور سے ہلائی۔ بگے کی دم نے اس کی خوب صورت دھاری دار شرٹ کو گندا کر دیا اور وہ خوف زدہ ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھا اور بری طرح گر پڑا۔ پھر فوراً اٹھا اور دوبارہ اپنے شکار کی طرف بھاگا۔ جب وہ لالی کے قریب پہنچا تو لالی حیرت انگیز طور پر اڑ کر کچھ دور جا گری۔ لڑکے کو بہت غصہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں ائرگن ابھی بھی تھی۔ اس نے اس میں چھرا ڈالا اور چند قدم کے فاصلے پر پھڑپھڑاتی لالی کو ایک دفعہ پھر نشانہ بنا ڈالا۔

اس دفعہ پرندے نے دو تین قلابازیاں کھائیں اور ساکت ہو گیا۔ میں جان گیا کہ لالی مر چکی ہے۔ مجھے اب اس پر شدید غصہ آیا۔ مگر یہ لالی میری پالتو تھوڑی تھی جو میں اس پر احتجاج کرتا۔ پھر انہوں نے لالی کو اٹھایا اور اسے مردہ پا کر دور پھینک دیا۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر نیا نشانہ باندھنے لگے۔ اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں ہل روک کر ان

نے پاس جا پہنچا۔ اور اپنی آواز کو دھیما رکھ کر بولا "بیٹے! ان معصوم پرندوں کو مار کر تمہیں کیا حاصل ہوتا ہے؟"

"دیکھو چاچا یعقوب! تم خواہ مخواہ ہمارے شکار کا ستیاناس نہ کرو۔ یہ میرے ماموں کے بیٹے ہیں۔ شہر سے آئے ہیں کہ یہاں گاؤں میں بہت شکار ہوگا اور اب شکار نظر آیا ہے تو تم نصیحت کرنے بیٹھ گئے ہو"۔ چودھری کا بیٹا نذیر رعب سے بولا۔

ادھر ہم باتیں کر رہے تھے کہ ادھر ان کا ایک ساتھی چند گز کے فاصلے پر بیٹھی ایک اور لالی کو نشانہ بنا رہا تھا۔ میں نذیر کو اس بات کا جواب دینے کے لئے سوچ رہا تھا کہ ٹھائیں کی آواز آئی اور ساتھ ہی بہت سارے پرندوں نے شور مچا دیا۔ اس دفعہ بھی اس لڑکے کا نشانہ صحیح لگا اور ایک اور لالی زخمی ہو کر پھڑپھڑانے لگی۔ وہ اس کی طرف بھاگنے لگا تو اس کا بھائی بولا "عرفان! دیکھو ادھر کتنے پرندے جمع ہیں۔"

شاید قدرت میں کسی اس زخمی لالی کو پکڑ کر ہی دم لیتا۔

عرفان کو اپنے بھائی کی بات پسند آئی اور اس نے اپنی بندوق کا رخ پرندوں کے جھنڈ کی طرف کر دیا۔ وہ پرندے ہمارے سے مشکل فاصلے میں خود ہی ایں تھا کہ وہاں اتنی لالیاں کیوں جمع ہیں۔ اتنی دیر میں عرفان نے فائر کیا اور ایک مزید لالی زخمی ہو گئی۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ دوسری لالیوں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور اسی طرح شور مچاتی رہیں۔ ادھر عرفان ایک اور شکار کو تڑپتے دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گیا اور دیوانہ وار زخمی لالی کی طرف بھاگا۔

اس موقع پر نہ جانے کیوں مجھے خطرے کا ایک عجیب سا احساس ہوا۔

ٹھیک اسی لمحے مجھے اپنے بیلوں کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ بگا اور لنڈا دونوں اپنے نتھنوں سے پھوں پھوں کی آواز نکالتے میری

طرف بھاگے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ فوری طور پر یہی بات ذہن میں آئی کہ پرندوں اور بیلوں کا یوں شور مچانا یقیناً کسی آنے والی مصیبت کی طرف اشارہ ہے۔ اچانک میری نظر ایک ایسی چیز پر پڑی کہ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میں نے تھوڑا دوسری طرف دیکھا جہاں اب عرفان لالیوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ تین لالیاں حیرت انگیز طور پر اس کی آمد سے بے خبر رہیں یہاں تک کہ اس نے زخمی لالی کو پکڑا۔ تب ایک دم سے تمام لالیاں شور مچاتی اڑ گئیں اور میری نظریں ایک مرتبہ پھر وہ خوف ناک چیز دیکھ رہی تھیں جو میں نے بیلوں کے پاس دیکھی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا چتکبرا سانپ تھا۔ نو فٹ لمبے اور میری پنڈلی جتنے موٹے اس سانپ کو آپ ایک چھوٹا اژدھا کہہ سکتے ہیں۔ اور ان لڑکوں میں سے عرفان اب اس کا شکار ہونے والا تھا۔

دراصل سانپ اس وقت تک کسی پر حملہ نہیں کرتا جب تک اس پر حملہ نہ کیا جائے اور عرفان جس طرح بھاگ کر وہاں گیا تھا اس سے سانپ یہی سمجھا ہو گا کہ اس پر حملہ کیا گیا ہے۔ میرا اندیشہ درست نکلا۔ عرفان اچانک اتنے بڑے سانپ کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا تو مٹی کے ڈھیلوں سے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑا۔ اس موقع پر میں نے عجیب منظر دیکھا بلکہ ایک ناقابلِ یقین منظر!

جوں ہی سانپ تیزی سے عرفان کی طرف بڑھا، تین چار لالیاں کسی جنگی طیارے کی طرح غوطہ لگاتے ہوئے آئیں اور اپنی ننھی چونچوں سے سانپ پر ٹھونگا سا لگا کر چند فٹ دور بیٹھ کر شور مچانے لگیں۔ پھر باری باری ہر لالی آتی اور سانپ کے ٹھونگا سا لگا کر چند فٹ پرے بیٹھ جاتی۔ اس موقع پر سانپ تھوڑی دیر کے لیے جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ اب موقع سے فائدہ اٹھانا میرا کام تھا۔ میں بجلی کی تیزی سے عرفان کی طرف بڑھا اور اسے گھسیٹ کر سانپ سے چند فٹ دور کیا۔ خود عرفان نے بھی اپنی ہمت سے کام لیا اور اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے ایک طرف بھاگ گیا۔ میں نے فوراً اونچی آواز میں کچھ دور موجود اپنے پڑوسی کسان دین محمد کو آواز دی۔

"او دین محمد! جلدی آؤ! لاٹھی لے کر آ!"

اور پھر میں اپنی حویلی کی طرف بھاگا۔ مجھے واپس آنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔ واپسی پر میرے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی تھی۔ جب کہ چودھری کا بیٹا اور محسن سے اس سانپ کا نشانہ لے رہا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے روکا اور پیچھے سے جا کر پوری قوت سے لاٹھی کا وار اس موذی جانور پر کیا۔ وار خاصا کاری ثابت ہوا اور سانپ زمین پر لوٹنے لگا۔ اتنی دیر میں دین محمد بھی آ گیا وہ بھی میرے ساتھ مل کر اس چھوٹے اژدھے پر لاٹھیاں برسانے لگا۔ دس بارہ ٹھکانے لگانے کے بعد ہم نے سکھ کا سانس لیا۔

لالیاں اور دوسرے پرندے اب بھی شور مچا رہے تھے۔ میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ عرفان نے کہا "چچا یعقوب، آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے میری جان بچائی!"

اس دفعہ اس کا رویہ ایسا تھا جیسا پڑھے لکھے لڑکوں کا ہوتا ہے۔ میں نے کہا "بیٹا شکریہ تو ان پرندوں کا ادا کرو جن کی وجہ سے تمہاری جان بچی!"

وہ شرمندہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہے تو میں بولا "بیٹا اگر تم میرا کچھ احسان مانتے ہو تو ایک وعدہ کرو"۔

"کیا چچا؟ آپ فرمائیں تو سہی!"

"وہ یہ کہ ان پرندوں کو کبھی نہ مارنا۔ خاص طور پر ہل چلاتے کسان کے کھیت میں ہوتے ہیں۔ یہ پرندے تو ان چھوٹے چھوٹے موذی کیڑوں کو کھاتے ہیں جو اگر زندہ رہ جائیں تو فصلوں کو بہت نقصان پہنچائیں۔ مجھے اس لیے تمہارا انہیں شکار کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن تم ٹھہرے ہمارے چودھری صاحب کے مہمان اور پھر شہر کے پڑھے لکھے بابو..... اس لیے خاموش رہا"۔

"چچا اب ہمیں شرمندہ نہ کرو۔ ہم پڑھے لکھے ہوتے تو یہ دوست پرندوں کو کبھی نہ مارتے..... ہم تو اس معاملے میں بالکل جاہل ہیں..... ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ پرندے انسان کے کس قدر اچھے دوست ہیں!"۔

"بہت اچھے دوست ہیں یہ پرندے..... یقین جانو ان کی وجہ سے میرا چھڑکاؤ پر خرچ آنے والا بہت سا روپیہ بچ جاتا ہے۔ اور فصل بھی اچھی ہوتی ہے!"

شہر کے دونوں لڑکوں نے میرا شکریہ ادا کیا لیکن چودھری نثار کا بیٹا ندیم بالکل خاموش رہا۔ آخر بڑا زمین دار جو تھا۔ بہت بڑا مگر ان مجھے دوستوں کی افادیت سے وہ بھی متاثر لگ رہا تھا۔

مزاحیہ سائنس فکشن
روبوٹ کہانی

روبوٹ کے بس کا کام نہیں

حسن ذکی کاظمی

کئی دنوں سے اخباروں میں "بسٹ روبوٹس" نامی شوروم کا اشتہار چھپ رہا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ اس جاپانی کمپنی نے جس کے وہ ایجنٹ ہیں کچھ نئی قسم کے روبوٹس تیار کیے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔

شہر میں یوں تو روبوٹس کے کئی شوروم کھل چکے تھے لیکن "بسٹ روبوٹس" نے تھوڑے ہی دنوں میں جتنی شہرت حاصل کی وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی۔ یہ شوروم 2025ء میں کھلا تھا اور پانچ سال میں اس نے نہ صرف شہر بلکہ پورے ملک میں اپنی ساکھ قائم کر لی۔ اس ترقی کی وجہ جہاں ایک طرف اس ادارے کی ایمان داری اور وعدے کی پابندی تھی وہاں دوسری طرف اس میں "بسٹ روبوٹس" کے منیجر کی خوش اخلاقی کا بھی بڑا دخل تھا۔

بوری والا اینڈ کمپنی کے مالک سیٹھ ڈوڈی جی بوری والا کی نظر اس اشتہار پر پڑی تو وہ اچھل پڑے کیوں کہ اشتہار میں ایک ایسے روبوٹ کا بھی ذکر تھا جو پرائیویٹ سیکریٹری کا کام بڑے اچھے طریقے سے کر سکتا تھا۔ ڈوڈی سیٹھ اپنے سیکریٹری کے انتقال کے بعد سے کسی اچھے سیکریٹری کی تلاش میں تھے۔ یوں تو دفتر کا کام اچھا برا چل ہی رہا تھا لیکن اب سیکریٹری کی سخت ضرورت پیش آ رہی تھی کیوں کہ سیٹھ نے شہر کے میئر کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور الیکشن زیادہ دور نہ تھا۔

ڈوڈی سیٹھ نے ٹیلی فون پر "بسٹ روبوٹس" کے منیجر کا نمبر ملوایا اور اپنا مطلب بیان کیا۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد منیجر نے کہا کہ وہ خود سیٹھ جی کی خدمت میں حاضر ہو کر ساری تفصیل بتائے گا۔

دوسرے دن صبح صبح منیجر اپنے وعدے کے مطابق ڈوڈی سیٹھ کے دفتر پہنچ گیا اور انھیں نئے روبوٹ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"سیٹھ جی! انسان کی شکل کے روبوٹس تو آپ نے

بہت دیکھے ہیں جو اینڈرائڈ android کہلاتے ہیں۔ یہ ہمارا نیا روبوٹ ان سے کافی آگے ہے۔ اس میں کمپیوٹر کا استعمال کم سے کم ہے۔ اس کی ساخت میں زیادہ سے زیادہ انسانی خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ انسان کی طرح دکھائی ہی نہ دے بلکہ اس کی سوچ سمجھ، پسند ناپسند، مرضی اور طور طریقے سب انسان کی طرح ہوں۔ اسی لیے اس روبوٹ کو "بائیو روبوٹ" کا نام دیا گیا ہے۔

ڈوڈی سیٹھ حیرانی سے منیجر کی شکل دیکھ رہے تھے۔ ابھی منیجر نے اپنی بات ختم نہ کی تھی کہ وہ بول پڑے "بھائی، اپن کو تو آپ یہ بتاؤ کہ یہ آپ کا روبوٹ سکریٹری کا سارا کام کرے گا؟ ہماری بات سمجھ لے گا؟"

منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا "سیٹھ جی! آپ کی بات نہیں سمجھے گا تو ادھر شہر میں کیسے رہے گا۔ اس کی ایسی تربیت کی جائے گی کہ آپ کے حکم پر چلے گا اور سولہ آنے آپ کی مرضی کے مطابق کام کرے گا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ "کام کرے گی" کیوں کہ یہ لیڈی سکریٹری ہے۔ یہ سکریٹری دفتر کے کام کے علاوہ اپنے باس کے کھانے پینے، صحت اور آرام کا بھی خیال رکھتی ہے۔ اب تو خوش ہیں سیٹھ جی؟"

سیٹھ نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولے "تو بھلا سیٹھ کو اور کیا چاہیے۔ دفتر کا کام بھی چوکھا ہو، کھانا پینا بھی ٹھیک ہو اور صحت بھی بنی رہے۔ پر اس وقت تو سب سے بڑا کام الیکشن کا ہے۔ منیجر صاحب، یہ بتاؤ کہ ہماری سکریٹری آئے گی کب ادھر؟"

منیجر نے سوچتے ہوئے کہا "سیٹھ جی! آپ سے غلط وعدہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آپ مجھے کم از کم تین ہفتے دیں"۔

"تین ہفتے!" سیٹھ جی اچھل پڑے اور بولے "او بھائی! تم تو ہمارا کام چوپٹ کرا دو گے۔ دیکھو الیکشن میں دو ہفتے رہ گئے ہیں۔ جلدی کرو میرے بھائی"۔

منیجر نے اٹھتے ہوئے کہا "سیٹھ جی کوشش کروں گا لیکن وعدہ تین ہفتے کا ہی ہے کیوں کہ تربیت کرنے میں وقت لگتا ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی کسر رہ جائے اور آپ سے شرمندہ ہوں"۔

بنسٹ روبوٹس کا منیجر وعدے کی تاریخ سے چار دن پہلے بائیو روبوٹ ٹو کو ساتھ لے کر بوری والا اینڈ کمپنی کے دفتر پہنچا۔ جب سے بی آر ٹو کے آنے کا فیصلہ ہوا تھا سارے دفتر والوں کو اسے دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ اب جو اس کے آنے کی خبر دفتر میں پھیلی تو ایک کھلبلی مچ گئی اور لوگ اسے دیکھنے کے لیے دوڑ پڑے۔ منیجر بی آر ٹو کو ساتھ والے کمرے میں بٹھا کر اکیلا سیٹھ کے کمرے میں گیا۔ ڈوڈی سیٹھ اسے دیکھتے ہی بولے "اکیلے آگئے؟"

منیجر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "سیٹھ جی! آپ سے مار کھانا تھی جو اکیلا آتا؟ آپ کی سکریٹری برابر والے کمرے میں ہے۔ بس جلدی جلدی آپ کو چند باتیں بتا دوں پھر آپ کی ملاقات بی آر ٹو سے کراتا ہوں"۔

منیجر نے بریف کیس کھولتے ہوئے کہا "بس آپ مجھے دو منٹ دیجیے۔ ساری بات بتاتا ہوں۔ اے یہ لیجیے"۔ منیجر نے بڑے بٹن کے برابر کے دو آلے سیٹھ جی کی طرف بڑھائے۔ یہ پولی گراف کہلاتے ہیں۔ یہ آلہ بیسویں صدی کے تقریباً درمیانی حصے میں ایجاد ہوا تھا۔ یہ کسی بھی شخص کی نبض کی رفتار، سانس کی رفتار اور پسینے کا پتا چلا سکتا تھا اور اگر اس شخص کو باتیں کرتے وقت پسینہ زیادہ آتا یا اس کا سانس اور نبض تیز ہو جاتی تو یہ اندازہ لگا لیا جاتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ آلہ بہت دنوں تک امریکی عدالتوں میں گواہی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا اور اب بھی بہت سی جگہ استعمال ہو رہا ہو گا۔ بہت سے لوگوں کو اس کے بارے میں شبہ بھی تھا اور ان کا خیال تھا کہ اس آلہ یعنی پولی گراف کی گواہی کوئی یقینی بات نہیں۔ بہرحال اب ہماری کمپنی نے اس جھوٹ پکڑنے والے آلے کی بالکل نئی شکل تیار کی ہے جو نبض اور سانس کی رفتار، زبان کی لڑکھڑاہٹ، آواز کی کپکپاہٹ، پسینے کی مقدار اور پورے جسم کی کیفیت کو ریکارڈ کر کے یقینی طور پر یہ بتا سکتی ہے کہ کسی

شخص کی باتوں میں کتنے فی صد جھوٹ ہے اور کتنا سچ"۔

اب ڈوڈی سیٹھ سے بالکل صبر نہ ہو سکا اور وہ بڑی بے تابی سے بولے "او بھائی! آپ یہ کیا داستان لے بیٹھے ہو۔ میرے کو تو سیدھی سیدھی بات بولو کہ اپن کو کرنا کیا ہے؟"

منیجر نے سیٹھ کو تسلی دی "سیٹھ جی، بس میری بات ختم ہو رہی ہے۔ یہ دونوں آلے جو میں نے آپ کو دیے ہیں انھیں آپ ان دونوں کرسیوں میں لگا دیجیے جو آپ کی میز کے اس طرف مہمانوں کے لیے رکھی ہیں اور پھر سارا کام سکریٹری پر چھوڑ دیجیے جس کے پاس ریموٹ کنٹرول ہے۔ وہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اس شخص کی ساری کیفیت جان لے گی جو اس کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرے گا"۔

ڈوڈی سیٹھ پی آر ٹو کے کام سے بے حد خوش تھے۔ انھوں نے اس کا نام روبی رکھ دیا تھا۔ وہ ہر کام میں اس سے مشورہ کرتے اور اس کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ روبی جس دن سے دفتر میں آئی تھی الیکشن کے کام کا زور تھا۔ صبح سے رات تک لوگ سیٹھ صاحب سے ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے اور اپنی حمایت کا یقین دلاتے تھے۔ سیٹھ جی کو صبح شام ان کے ایجنٹ رپورٹ پیش کرتے جس میں بتایا جاتا کہ عوام کیا چاہتے ہیں، وہ کس طرح کے امیدوار کو ووٹ دیں گے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ملک میں انتخاب کونسلرز کے بجائے عام ووٹرز براہ راست کر رہے تھے۔ لہٰذا کام بہت بڑھ گیا تھا اور صحیح اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ حالات کیا ہوں گے۔ البتہ ڈوڈی سیٹھ کے لیے روبی کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ جو لوگ سیٹھ سے ملنے آتے تھے روبی انھیں ان دونوں کرسیوں پر بٹھاتی اور ان کی باتوں کے دوران میں اس کی نظریں اپنے ریموٹ کنٹرول پر رہتیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ سیٹھ کو رپورٹ ٹائپ کر کے دیتی مثلاً مسٹر ایکس آپ سے جو باتیں کر رہے تھے اس میں اسی فی صد جھوٹ تھا اور بیس فی صد سچ۔ وہ آپ سے جو رقم مانگ رہے تھے اس میں سے وہ شاید ہی الیکشن کی پبلسٹی پر خرچ کریں۔ یا پھر یہ کہ مسٹر وائی کی باتوں میں بالکل خلوص نہیں تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دوسرے امیدوار سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ ان سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے"۔

ایک رپورٹ اس طرح تھی یہ صاحب جو ابھی آپ کے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں یہ آپ کو اسحاق نیچے کا بالکل بے وقوف سمجھتے ہیں۔ انھوں نے شہر کے لوگوں میں آپ کی مقبولیت کا جس طرح ذکر کیا اس میں بے حد مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے وہ یہ چاہتے ہوں کہ آپ مطمئن ہو جائیں اور اپنی کوششوں میں کمی کر دیں جس کا فائدہ دوسرے امیدوار کو پہنچے گا۔ کون جانے اس کام کے لیے انھیں دوسری طرف سے رقم مل گئی ہو"۔

سیٹھ جی ایک طرف تو پولی گراف کے کمال کو مان گئے اور دوسری طرف روبی کی سوجھ بوجھ اور عقل مندی کے قائل ہو گئے کیوں کہ اس نے ڈوڈی سیٹھ کو جو باتیں بھی بتائیں ان کی چند دن کے بعد تصدیق ہو گئی۔

انتخابی مہم زور شور سے جاری تھی۔ الیکشن میں اب چند روز باقی تھے۔ ڈوڈی سیٹھ اپنے الیکشن منیجر کو ساتھ لیے دفتر میں داخل ہوئے اور دونوں مہمانوں والی کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ الیکشن منیجر نے کہا۔ "سیٹھ جی! میرا خیال ہے اب وہ سماجی بھلائی والا اعلان بھی کر دیجیے۔ اب اس کا وقت آ گیا ہے"۔

سیٹھ جی کچھ سوچتے ہوئے بولے "ارے ہاں! خوب یاد دلایا"۔ پھر وہ سامنے کھڑی ہوئی روبی سے مخاطب ہوئے "ایک پریس ریلیز تیار کر لو۔ اس میں بتانا ہے کہ ہم کچھ فلاحی اداروں کے ساتھ مل کر لاوارث بچوں کے لیے ایک ادارہ بنوا رہے ہیں جس میں ان کے رہنے، علاج معالجے اور تعلیم و تربیت کا انتظام ہو گا۔ اس کے خرچ کا دو تہائی حصہ ہماری کمپنی برداشت کرے گی۔ جو جلد ہی قائم ہونے والی ہے"۔

دوسرے دن صبح صبح "بیسٹ روبوٹس" کا منیجر ڈوڈی سیٹھ سے ملنے آیا اور ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا "سیٹھ جی! عجیب بات ہوئی ہے۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن بات یوں ہے کہ پی آر ٹو نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ آپ کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتی"۔

سیٹھ جی تو حیرانی سے اچھل پڑے اور بولے "کیوں؟ کیا ہوا؟"۔

منیجر نے بات ٹالتے ہوئے کہا "چوں کہ اسے آپ کے پاس آئے ہوئے دو ماہ سے کم عرصہ ہوا ہے لہٰذا معاہدے کے مطابق ہم آپ کی پوری رقم واپس کریں گے"۔

سیٹھ جی تو منیجر پر برس پڑے "تم رقم کی بات کرتے ہو۔ الیکشن سر پر ہے۔ کام کون کرے گا؟ یہ تو کھلا دھوکہ ہے ہمارے ساتھ۔ آخر بات کیا ہے؟"

منیجر نے ایک کاغذ ڈوڈی سیٹھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اسے آپ پی آر ٹو کا استعفیٰ سمجھ لیجیے یا پولی گراف کی آخری رپورٹ"۔

سیٹھ نے جلدی سے کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا "کاش سیٹھ جی مہمانوں والی کرسی پر نہ بیٹھتے۔ یوں لگتا ہے کہ یہاں چاروں طرف جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ اور سیٹھ جی تو جھوٹوں کے سردار معلوم ہوتے ہیں۔ مکر، فریب اور بے اصولی کے اس ماحول میں صرف انسان ہی کام کر سکتا ہے۔ یہ روبوٹ کے بس کا کام نہیں"۔

دلچسپ اور ناقابلِ یقین

عبدالستار خان طاہر

صرف ایک لڑکا

آئرلینڈ میں دو قبیلوں کی آپس میں خاندانی برتری کے مسئلے پر لڑائی ہوئی۔ ان میں سے ایک قبیلے کے تمام افراد لڑائی میں مارے گئے۔ صرف ایک لڑکا زندہ بچا جس کا نام "وانگ کو" تھا۔ جوان ہو کر اس نے شادی کی۔ جب وہ مرا تو بیالیس بیٹوں کا باپ تھا اور اس نے اپنا ایک نیا قبیلہ بنا لیا تھا۔ جس کا وہ سردار تھا۔

کبوتروں سے عشق

ایران کے شاہ حسین (1675ء۔ 1728ء) کو کبوتروں سے عشق تھا۔ اس نے اپنے ملک میں یہ فرمان جاری کر رکھا تھا کہ ایران میں کبوتروں کو شکار کرنا جرم ہے اور اس نے اس جرم کی سزا موت مقرر کی تھی۔

بابل کا قدیم بادشاہ حمورابی

بابل کے قدیم بادشاہ حمورابی کی تاریخ میں اس وجہ سے شہرت ہے کہ اس نے تاریخ میں پہلی دفعہ قوانین بنائے تھے۔ اس بادشاہ نے یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ اگر اس کے کسی درباری یا رشتے دار کی بینائی ضائع ہو گئی تو اس کے ڈاکٹر کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔

سرخ بال

1673ء میں طرابلس کا بادشاہ مر گیا۔ لیکن اس کے تخت و تاج کا کوئی وارث نہ تھا۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ کسی اور کو بادشاہ چن لیا جائے۔ بڑی تلاش کے بعد ایک ترکی سپاہی "محمد الحداد" کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس میں خوبی یہ دیکھی گئی تھی کہ پورے ملک میں وہ واحد شخص تھا جس کے سر کے بال سرخ رنگ کے تھے۔

عجیب اتفاق

اٹلی کے "روولف سلوائیز" کا انتقال 1899ء میں 89 برس کی عمر میں ہوا تو اس وقت اس کے 23 بیٹے، 23 پوتے اور 23 پڑپوتے تھے۔

ایک خاتون

انڈیانا (امریکا) کی ایک خاتون سینڈی ایلن کا وزن 89 سال کی عمر میں 421 پونڈ اور اس کا قد سات فٹ ساڑھے پانچ انچ تھا۔

انسانی کمپیوٹر

پولینڈ کے مورخ اور تاریخ دان "البرٹ ایندی" کو پہلا زندہ انسانی کمپیوٹر کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک بار جس کتاب کو پڑھ لیتا تھا اسے اپنے ذہن میں لفظ بہ لفظ محفوظ کر لیتا تھا۔ وہ پوری کتاب کو کاغذ پر اپنے حافظے کی مدد سے منتقل کر دیتا تھا اور اس سے کبھی ایک لفظ کی بھی غلطی نہ ہوئی تھی۔ اس لیے حکومت نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی کہ اسے سرکاری اور خفیہ نوعیت کی دستاویزات نہ دکھائی جائیں۔

29 بار

ایران کے بادشاہ کریم خان (1699ء - 1779ء) کو اس کی بادشاہی کے زمانے میں 29 بار قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ ہر بار بچ گیا۔ اس نے ہر بار اپنے قاتلوں کو معاف کر دیا اور 1779ء میں طبعی موت مرا۔

افسوس

ترکی کے سلطان احمد اول کے لیے مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ وہ اپنی تین ہزار بیویوں کو ریشمی کپڑے تحفے کے طور پر دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے خالص ریشم گزوں کے حساب سے نہیں ٹنوں کے حساب سے درکار تھی۔ ایران ریشم کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ سلطان احمد اول نے ریشم کی خاطر 1611ء میں ایران پر حملہ کر دیا۔ مگر شکست سے دوچار ہوا۔ اس کی بیویوں کو اس کی شکست کا بہت زیادہ افسوس ہوا۔ اصل میں یہ افسوس شکست کا نہیں بلکہ اس بات کا تھا کہ ان کا خاوند ان کے لیے ریشم حاصل نہیں کر سکا تھا۔

سفید رنگ

سکاٹ لینڈ کے ایک قلعہ دار "فرگوسن" نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کی جاگیر کے علاقے میں سفید رنگ کی کوئی چیز دکھائی نہ دے۔ اس کی جاگیر میں سفید رنگ کے تمام پرندوں، مرغوں، بطخوں وغیرہ کو ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ سفید رنگ کے کپڑے پہننا بھی جرم تھا۔ اس حکم کا پس منظر یہ تھا کہ اس کے دشمن کے جھنڈے کا رنگ سفید تھا۔

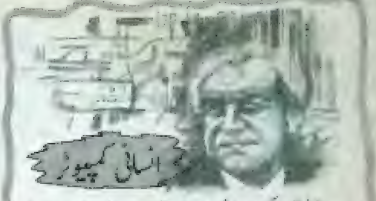

ایک جان

امریکا کی خانہ جنگی میں "ناتھن ہیل" نام کے ایک اسکول ٹیچر کو انگریزوں نے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا اور مقدمہ چلائے بغیر اسے سزائے موت دے دی۔ اسے طنزیہ کہا گیا "اب تمھیں اپنے جرم پر افسوس تو ضرور ہو گا"۔ اس نے کہا "مجھے افسوس یہ ہے کہ اپنے ملک پر قربان کرنے کے لیے میرے پاس صرف ایک جان ہے"۔

دوسری بار پھانسی

جب روس کے عوام نے اپنے بادشاہ کے خلاف مسلح بغاوت کر دی جو انقلاب روس کے نام سے مشہور ہے تو بہت سے انقلابی پکڑے گئے۔ زار (بادشاہ) روس نے حکم دیا کہ ان میں سے کسی پانچ کو سزائے موت دے دو اور باقی سب کو سائبیریا بھیج دو۔ زار نے یہ بھی کہا کہ "خون کا ایک قطرہ نہ بہے"۔

چنانچہ پانچ آدمیوں کو گولی یا تلوار سے ہلاک کرنے کے بجائے انھیں پھانسی دی جانے لگی۔ لیکن وہاں پھانسی دینا کوئی نہ جانتا تھا۔ تین آدمیوں کو بہ یک وقت پھانسی کے تختے پر، جس کے نیچے گڑھا کھودا گیا تھا، کھڑا کر دیا گیا۔ ان کی گردنوں میں رسے ڈال کر نیچے سے تختہ کھینچ لیا گیا۔ لیکن تینوں کے رسے ڈھیلے ہونے کی وجہ سے وہ زندہ گڑھے میں جا پڑے۔ انھیں پھر تختے پر کھڑا کیا گیا تو ان میں سے ایک

نے بلند آواز سے کہا "میں خوش ہوں کہ اپنے ملک کو ظالم بادشاہوں سے آزاد کرانے کے لیے دوسری بار پھانسی چڑھ رہا ہوں"۔

تیمور لنگ کی پیش گوئی

تاریخ کا مشہور جنگجو تیمور لنگ ہندوستان پر حملے سے پہلے (1397ء تک) ان ممالک کے مجموعی طور پر بیس لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا جو اس نے فتح کیے تھے۔ وہ مرا تو اسے سمرقند میں دفن کیا گیا۔ روسی سائنس دانوں نے آثار قدیمہ کے مطالعہ اور تجزیے کے سلسلے میں تیمور لنگ کی قبر کھدوائی اور اس کا تابوت نکال کر کھولا۔ اس کی لاش اچھی حالت میں تھی۔ اس کی قبر کے پتھر پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ "اگر مجھے ایک بار پھر زمین پر لایا جائے تو دنیا تاریخ کی سب سے بڑی اور ہول ناک جنگ دیکھے گی"۔

تیمور لنگ کے تابوت سے اس کی لاش نکال کر باہر رکھی گئی۔ یہ 22 جون 1941ء کی صبح تھی جب پانچ بجے اس کی لاش نکالی گئی تھی۔ اسی روز جرمنی نے ایک سو ساٹھ ڈویژن فوج اور چودہ ہزار ٹینکوں سے روس پر حملہ کر دیا اور دنیا نے تاریخ کی سب سے بڑی اور ہول ناک جنگ دیکھی۔

طاقت اور نفاست

تلوار ہر فوجی کی عزت ہوا کرتی تھی۔ غیرت والے جان دے دیتے تھے لیکن تلوار نہیں دیتے تھے۔ یعنی فوجی کے لیے ہتھیار ڈالنا اتنی زیادہ بے غیرتی سمجھا جاتا تھا کہ اسے ذلیل کر کے فوج سے نکال دیا جاتا تھا۔ تلوار بڑا قدیم ہتھیار ہے۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی بدلتی رہی لیکن یہ رہی بالکل سیدھی۔ جنگوں کی تاریخ اور ہتھیاروں کے ماہرین کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کی شکل بدل کر کارگر روایت ڈالی تھی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے (دراصل رسول اللہ ﷺ نے) تلوار کو ٹیڑھا بنایا یعنی پہلی تاریخ کے چاند جیسی شکل دی۔

غیر مسلم دنیا میں یہ سمجھا جاتا رہا کہ مسلمانوں کا نشان چاند ستارہ ہے۔ اس لیے انہوں نے تلوار چاند کی شکل کی بنائی ہے۔ لیکن ماہرین نے کہا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی بنائی ہوئی چاند نما تلوار ایک ہی وار میں گردن کاٹ دیتی ہے۔

عیسائیوں (صلیبیوں) کی تلوار بالکل سیدھی ہوتی تھی۔ صلیبی جنگوں کے عیسائی ہیرو رچرڈ سوم نے ایک بار سلطان صلاح الدین ایوبی سے ملاقات کی اور سلطان پر اپنی طاقت، تلوار کی مضبوطی اور تیزی کا رعب جمانے لگا۔ اس نے دو ستونوں پر لوہے کا ایک سریا رکھا اور تلوار کا اتنا طاقت ور وار کیا کہ سریا کٹ گیا۔ رچرڈ نے کہا "یہ عیسائیت کی طاقت ہے"۔

صلاح الدین ایوبی نے اپنی تلوار نکالی اور ایک ریشمی رومال ہوا میں اچھال کر تلوار کا وار کیا اور رومال دو حصوں میں کٹ گیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے کہا "یہ اسلام کی نفاست ہے"۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ ہوا میں اچھالے ہوئے کپڑے کو تلوار سے ہر کوئی نہیں کاٹ سکتا اور ہر تلوار بھی اس کپڑے کو نہیں کاٹ سکتی۔ اس کمال کے لیے تلوار بہت تیز اور تلوار چلانے والا ماہر تیغ زن ہونا چاہیے۔ جب کہ اس کی نسبت لوہے کو کاٹنا آسان ہے۔

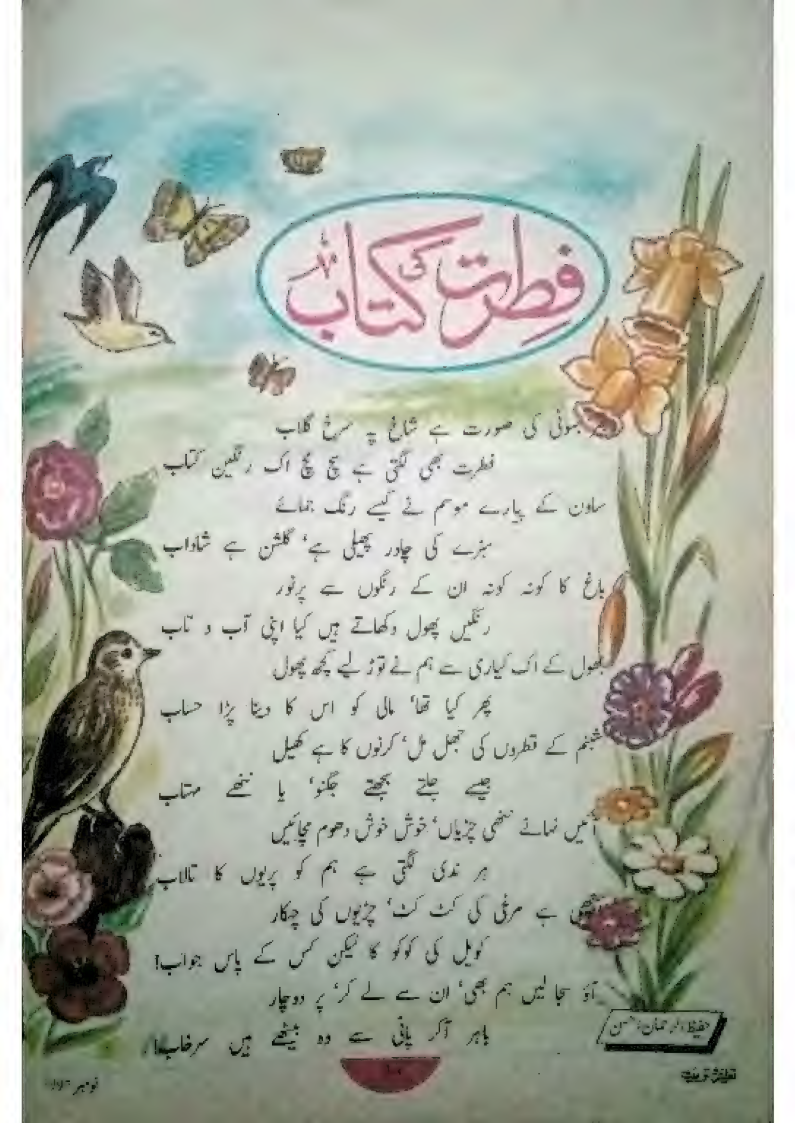

فطرت کی کتاب

بیر بہوٹی کی صورت ہے شاخ پہ سرخ گلاب
فطرت بھی لگتی ہے سچ مچ اک رنگین کتاب

ساون کے پیارے موسم نے کیسے رنگ جمائے
سبزے کی چادر پھیلی ہے، گلشن ہے شاداب

باغ کا کونہ کونہ ان کے رنگوں سے پرنور
رنگیں پھول دکھاتے ہیں کیا اپنی آب و تاب

پھول کے اک کیاری سے ہم نے توڑ لیے کچھ پھول
پھر کیا تھا، مالی کو اس کا دینا پڑا حساب

شبنم کے قطروں کی جھل مل، کرنوں کا ہے کھیل
جیسے جلتے بجھتے جگنو، یا ننھے مہتاب

آئیں نہانے ننھی چڑیاں، خوش خوش دھوم مچائیں
ہر ندی لگتی ہے ہم کو پریوں کا تالاب

بجتی ہے مرغی کی کٹ کٹ، چڑیوں کی چہکار
کوئل کی کوکو کا لیکن کس کے پاس جواب!

آؤ سجا لیں ہم بھی، ان سے لے کر، پر دو چار
باہر آکر پانی سے وہ بیٹھے ہیں سرخاب!

حفیظ الرحمان احسن

دوڑے ہم تتلی کے پیچھے باغ کے بیچوں بیچ
ایسا شوق سمایا دل میں، بھول گئے آداب!

سات ملیں جب رنگ تو مل کر سب ہو جائیں سفید
ساتوں رنگ دھنک کے لیکن قائم رہیں جناب!

ہر تارا اک ننھی کونپل کی صورت لہرائے
نیل گگن کی کھیتی بھی کیا لگتی ہے سیراب

لہریں لیتی ہیں ہلکورے، کشتی ڈولتی جائے
کیا کیا منظر دکھلاتے ہیں راوی اور چناب

دنیا کے سب پیارے منظر تو نے دیکھے خوب
اور بھی اک پیاری دنیا ہے، کھول کے دیکھ کتاب

ان سب چیزوں سے بڑھ کر ہے تیرے رب کی شان
رب کی شان سمجھنی ہو تو پڑھ سورت رحمان!

1۔ بیر بہوٹی: ایک سرخ رنگ کا کیڑا جو برسات میں پیدا ہوتا ہے اس کا جسم مخمل کی طرح نرم ہوتا ہے۔ 2۔ شاداب: ہرا بھرا۔ 3۔ آب و تاب: چمک دمک۔ 4۔ جھل مل: ستاروں کی طرح چمکنا۔ 5۔ مہتاب: چاند۔ 6۔ چہکار: چہکنا۔ 7۔ سرخاب: سرخ رنگ کا آبی پرندہ جس کے پر بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ 8۔ آداب: اچھے طور طریقے۔ 9۔ دھنک: قوس قزح۔ سات رنگوں کی کمان جو بارش کے بعد آسمان پر دکھائی دیتی ہے۔ سات رنگوں کو اگر گول پلیٹ پر الگ الگ لگا کر گھمایا جائے تو پلیٹ سفید نظر آتی ہے۔ 10۔ نیل گگن: نیلا آسمان۔ 11۔ سیراب: جس کو خوب پانی دیا گیا ہو۔ 12۔ ہلکورے: لہریں لینا، موجیں مارنا۔ 13۔ سورت رحمان: قرآن مجید کی سورت جس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں کا ذکر بیان ہے۔

شرارتی لکیریں
شاہد ریاض شاہد

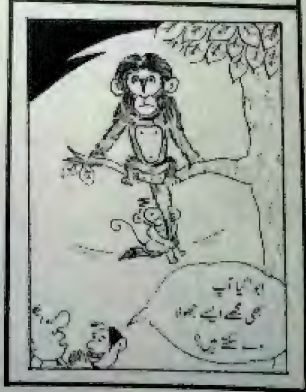

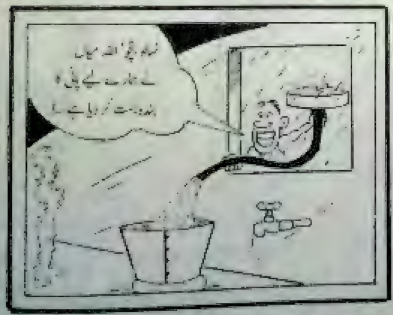

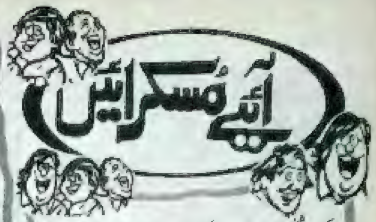

آئیے مسکرائیں

ایک شخص سے اس کی بیوی نے پوچھا "تمہارے اتنے گہرے دوست کی بیوی فوت ہو گئی اور تم افسوس کے لیے نہیں گئے"۔
"کس منہ سے جاؤں بیگم' وہ مجھے اپنی تیسری بیوی کے جنازے پر بلا رہا ہے جب کہ میں اسے ایک بار بھی نہیں بلا سکا"۔ (ایچ ایم عرفان عظیم ساہی وال)

دادی (پوتے سے) بتاؤ تمہیں کس نے مارا ہے؟ میں اسے کچا چبا جاؤں گی
پوتا: مگر دادی جان آپ کے تو دانت ہی نہیں ہیں
(صائمہ عبدالحئی حضرو)

لکڑہارا اپنے کم عمر لڑکے کے ساتھ جنگل میں گیا لکڑیاں کاٹتے ہوئے شام ہو گئی۔ تھکن سے برا حال تھا۔ واپسی پر راستہ بھول گیا۔ بہت تلاش کے بعد جب راستہ نہ ملا تو غصے سے اپنے بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا اور بولا "نامعقول' میں تو راستہ بھول گیا ہوں تو تو گھر جا' تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہو گی؟"۔
(خولہ نواز راول پنڈی)

غریب مریض: ڈاکٹر صاحب' میں بہت غریب ہوں میری فیس معاف کر دیجیے۔ کبھی آپ کے کام آؤں گا۔
ڈاکٹر: تم کام کیا کرتے ہو؟
مریض: حضور میں قبریں کھودتا ہوں (عمران بشیر لاہور)

ایک مکھی اپنے بچے کے ساتھ کسی گنجے کے سر پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ "دنیا میں کتنی تبدیلیاں ہو رہی ہیں" اس نے اپنے بچے سے کہا۔
"وہ کیسے ممی؟" صاحبزادے نے دریافت کیا۔
"میں جب تمہاری عمر کی تھی تو یہاں صرف فٹ پاتھ ہوا کرتا تھا" مکھی نے جواب دیا۔
(محمد آصف مرزا چیچہ وطنی)

ایک دوست: (دوسرے دوست سے) کاش میں وقت ہوتا' لوگ میری بہت قدر کرتے۔ ہر شخص میرا غلام ہوتا۔ لوگ میرے پیچھے بھاگتے لیکن میں کسی کے ہاتھ نہ آتا۔
دوسرا دوست: اگر تم وقت ہوتے تو لوگ اپنے گھر کی کھڑکیاں دروازے بند کر لیتے۔
پہلا دوست: وہ کیوں؟
دوسرا دوست: لوگ کہتے بھائی ہٹ جاؤ۔ کتنا برا وقت آ رہا ہے
(قمر دانی رکن ٹی)

ایک ڈاکٹر جو اسمبلی کا امیدوار تھا اپنے حلقے کی غریب آبادی میں تقریر کرتے ہوئے ان سے خوب وعدے کر رہا تھا۔ سامعین میں سے ایک بے باک آدمی بولا' ڈاکٹر صاحب' سنا ہے آپ بہت مغرور ہیں"۔

ڈاکٹر بولا: کون کہتا ہے کہ میں مغرور ہوں۔ اگر میں مغرور ہوتا تو آپ جیسے ٹکے ٹکے کے لوگوں سے ووٹ مانگتا؟ (خلیل زینب قادر سوات)

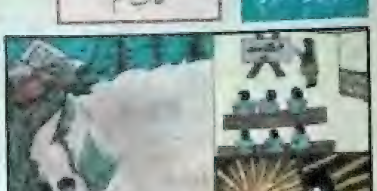

نونہال مصور

طالب علم

1 کرن خورشید، راولا کوٹ، پہلا انعام 60 روپے کی کتابیں۔

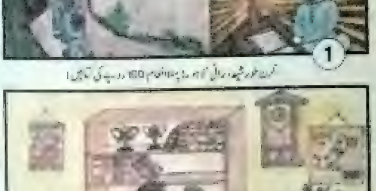

2 سید عرفان ساجد، ... دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں۔

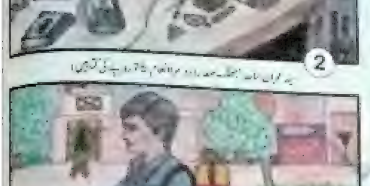

3 ... تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں۔

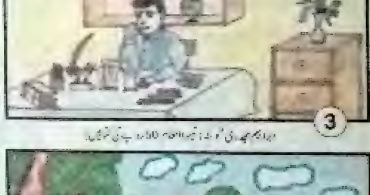

4 ... حبیب ... چوتھا انعام 45 روپے کی کتابیں۔

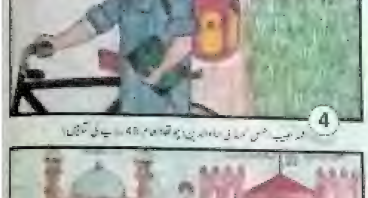

5 ... انعام 40 روپے کی کتابیں۔

6 ... انعام ... روپے کی کتابیں۔

ان نونہال مصوروں کی تصویریں بھی اچھی تھیں: نبیلہ نرگس، چیچہ وطنی۔ مصباح نور، چیچہ وطنی۔ عمارہ فاروق، فیصل آباد۔ نائلہ گلفام کیانی، راولپنڈی۔ محمد افضال جونڈی والا۔ محمد رضوان، کوہاٹ چھاؤنی۔ انور ریاض عرف وکی، شیخوپورہ۔ افق پرویز، اسلام آباد۔ محمد نوید، کوہاٹ چھاؤنی۔ سدرہ سلیم، لاہور۔ یاسمین افضل الرحمان، کراچی۔ عائلہ فرحان، کراچی۔ محمد طلال بابر، پشاور۔ عائشہ تنویر، کراچی۔ صوفیہ اسلم، بہاول پور۔ نعیم الوہاب، پشاور۔ عائشہ رحمان، ملتان۔ وقار احمد، اٹک۔ لبنیٰ صدیقی، کراچی۔ زبیدہ زاہدہ، لاہور۔ حبیب اللہ، لاہور۔ شیر نواز گل، مریدان۔ احمد نسیم قریشی، لاہور۔ آمنہ سلطان، کوٹ مومن۔ احمد سلطان، لاہور۔ شیر افضل خان، راولپنڈی۔ محمد یامین، سرگودھا۔ سید ستار احمد، راولپنڈی۔ حافظ ناظم، گوجرانوالہ۔ تنزیلہ اشفاق، منڈی بہاؤالدین۔ خولہ جمشید، لاہور۔ سید علی ناطق، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد عثمان منیب، لاہور۔ محمد افضل، اوچ شریف، بورے والا۔ محمد ایوب، ظاہر بورے والا۔ شاہ خالد، گوجرانوالہ۔ محمد عرفان بلوچ، شیخوپورہ۔ عزیز الرحمان، آذادی، شیخوپورہ۔ منظور ... چھوٹا۔ شاہد اقبال، اوکاڑہ۔ حمیرا شریف، پتوکی۔ رضوان شہزاد، لاہور۔ قرۃ العین، ملتان۔

آخری تاریخ ... نومبر

آخری تاریخ ... دسمبر

ہدایات: ... تصویر ... کاغذ پر ... تصویر کے پیچھے اپنا نام، عمر اور پورا پتا ... لکھیں ...

حسان عارف

سب سے کم عمر چیمپئن

سیاہ فام نو مسلم باکسر ملک عبدالعزیز سابق مائیک ٹائی سن کی ہنگامہ پرور زندگی اور حیرت انگیز کارنامے

☆ ☆ ☆

یہ 24 اور 25 مارچ 1995ء کی درمیانی رات کا منظر تھا

ریاست ہائے متحدہ امریکا کے شہر انڈیاناپولس میں واقع جیل "انڈیانا یوتھ سنٹر" کے باہر وسیع میدان میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں جو پرجوش نعرے لگا رہے ہیں۔ انھوں نے بینر، کارڈ اور خیر مقدمی پلے کارڈ اٹھا رکھے ہیں۔ سیکڑوں صحافی اور فوٹوگرافر بھی موجود ہیں جو متعدد اخبارات و جرائد کی طرف سے رپورٹنگ کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

چند ہی لمحوں کے بعد ایک سیاہ فام مرد آہن بڑے وقار کے ساتھ جیل کے صدر دروازے سے باہر آتا ہے۔ اس کے اردگرد محافظوں کا جمگھٹا ہے۔ ہجوم میں جوش و ولولے کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور ایک مسرت بھری آواز گونجتی ہے "ملک عبدالعزیز آگیا!" ویڈیو فلم والے اور فوٹوگرافر [illegible] ہیں۔

ملک عبدالعزیز تھوڑی دیر بعد اپنی لیموزین کار میں بیٹھ کر باکسنگ کے سابق عالمی چیمپئن محمد علی کلے اور اپنے سیکڑوں مداحوں کے ساتھ پلین فیلڈ اسلامک سنٹر پہنچتا ہے۔ سنٹر کے باہر جلی حروف میں ایک بینر آویزاں ہے جس پر لکھا ہے: "ملک عبدالعزیز! خدا تم پر رحمت کرے"۔

وہ مسجد میں داخل ہوتا ہے اور فجر کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ آہنی اعصاب کا مالک عبدالعزیز جس نے مکوں کی بارش کر کے اب تک لاتعداد مکے بازوں کو شکست کے آنسو رلائے تھے، اب بارگاہ رب العالمین میں کھڑا زار و قطار رو رہا تھا۔

نماز فجر سے فارغ ہو کر سنٹر کے امام محمد صدیق اعلان کرتے ہیں کہ مائیک ٹائی سن اسلام قبول کر چکے ہیں اور ان کا اسلامی نام ملک شہباز عبدالعزیز ہے۔ اس کے بعد عبدالعزیز ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے قید کے دوران میں ان سے ہمدردی کی۔ رہائی کے بعد وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں "یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے میرے لیے راہ ہدایت کشادہ فرمائی۔ مسلمان ہو کر مجھے ایک نئی قوت، نیا جذبہ اور نیا حوصلہ ملا ہے۔ میرے نزدیک اسلام دنیا کا سب سے بڑا امن پسند مذہب ہے۔ اسلام میرے لیے جان بچانے والی کشتی کی طرح ہے۔ اسلام زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرتا اور آدمی کو قوت

عطا کرتا ہے۔ اس سے زندگی بامقصد ہو جاتی ہے۔ اب میں ایک بہترین انسان کی طرح باقی ماندہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں جو زیادہ سے زیادہ دوسروں کے کام آسکے"۔

ملک عبدالعزیز سابق مائیک ٹائی سن کا ماضی بڑا کرب ناک ہے۔ وہ 1966ء میں نیویارک کی بستی بروکلین کے ایک عام سے گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ انتہائی ظالم اور ماں قناعت پسند خاتون ہے جس کا نام مورنا ٹائی سن ہے۔ وہ کل تین بھائی ہیں اور ملک عبدالعزیز سب سے چھوٹا ہے۔ مورنا ٹائی سن کی زندگی کا وہ دور جب ان کے بچے ابھی عملی زندگی میں نہیں آئے تھے' بہت سی مشکلات میں گزرا۔ ایک طرف وہ اپنے ظالم شوہر کا ظلم سہتیں اور دوسری طرف اپنے شرارتی بچوں کے ہاتھوں بے حد تنگ تھیں۔

ٹائی سن جب اسکول میں پڑھتا تھا تو اوباش لڑکوں کے گروہ کا رکن تھا۔ چناں چہ پڑھائی میں نویں جماعت سے آگے نہ جا سکا۔ عورتوں سے ان کے پرس اور زیورات چھیننا اور پولیس کو جل دے کر اپنے ٹھکانے پہنچ جانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ جلد ہی بروکلین کی بستی میں "وحشی نوجوان" اور "لٹیرا" کے ناموں سے مشہور ہو گیا۔ ٹائی سن بعض اوقات پولیس کو جل دینے میں کام یاب ہو جاتا' مگر پولیس ہر مرتبہ ناکام نہیں رہتی تھی۔ ایک ایسی ہی گرفتاری نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔

ایک دن وہ بروکلین کے تجارتی علاقے میں واردات کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار ہو گیا جس کے نتیجے میں اسے مجرموں کے اصلاحی مرکز نیویارک بھیج دیا گیا' مگر اس کی شرارتیں یہاں بھی جاری رہیں۔ ایک دن اس کی اپنے سے طاقت ور نوجوان سے مڈبھیڑ ہو گئی' اپنی حتی الامکان کوشش کے باوجود ٹائی سن نے بری طرح مار کھائی۔ اس واقعے کے بعد اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اسے اپنے آپ کو اس قدر طاقت ور بنا لینا چاہیے کہ کوئی ہاتھ اٹھانے تو بچ کر نہ جا سکے' چناں چہ اس نے جیل ہی میں باب سٹورٹ کی شاگردی اختیار کر لی۔ باب سٹورٹ نے ٹائی سن میں کھ بازی کا شوق اور صلاحیت دیکھتے ہوئے ایک ماہر کے باز ٹریز کس ڈے اماٹو کے حوالے کر دیا جس نے فلائیڈ پیٹرسن کو بھی عالمی چیمپئن بننے میں مدد دی تھی۔ کس ڈے اماٹو نے ٹائی سن کو ایک اچھا باکسر بنا دیا مگر بد قسمتی سے خود وہ نمونیا کے سبب 1984ء میں انتقال کر گیا۔

اگلا سال ٹائی سن کے لیے کام یابی کی نوید لے کر آیا اور اس نے رنگ کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ 1985ء ہی میں اس نے لیری ہومز کو چوتھے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر کے عالمی چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ تب اس کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ اگلے سال اس کے مقابل آنے والا کوئی نہ تھا اور وہ بلا مقابلہ چیمپئن قرار پایا۔ 22 نومبر 1986ء کو اس نے ٹریور باربک کو دوسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر کے عالمی ٹائٹل جیتا۔ یہ مقابلہ جیت کر اس نے باکسنگ کی تاریخ میں سب سے کم عمر ہیوی ویٹ چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کر لیا۔

7 مارچ 1987ء کو ٹائی سن نے ورلڈ باکسنگ ایسوسی ایشن چیمپئن جیمز سمتھ کو پوائنٹس پر شکست دی۔ واضح رہے کہ جیمز سمتھ "ہڈیاں توڑنے والا" کے نام سے مشہور تھا۔ 12 مارچ 1988ء کو ٹائی سن نے 21 برس کی عمر میں انٹرنیشنل باکسنگ ایسوسی ایشن کے ٹونی ٹیوبز کو دوسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر کے شکست فاش دی۔ 11 فروری 1990ء کو وہ اپنے کیریئر کی پہلی شکست سے دوچار ہوا۔ ٹوکیو کے مقام پر جیمز ڈگلس نے دسویں راؤنڈ میں ٹائی سن کو ناک آؤٹ کر دیا۔ تاہم جلد ہی اس نے متعدد کام یابیاں حاصل کر کے اپنی اس شکست کا داغ مٹا دیا۔ اب کوئی باکسر ایسا نہیں رہا تھا جو اس کا سامنا کر سکتا۔

پانچ سال رنگ میں رہنے کے بعد وہ اپنے مقابلے کے انعامات اور اجرت سے لکھ پتی بن گیا۔ اس کے بعد اسے زوال پذیر مغربی تہذیب کا شکار ہونا پڑا۔ اسے ایک ناجائز کیس میں ملوث کر دیا گیا۔ جس کے باعث اسے جیل جانا پڑا۔ مگر جیل کی دیواریں اس کے لیے رحمت خداوندی ثابت

ہو گیں۔ قید تنہائی میں اس کی سوچ میں ایک غیر معمولی تبدیلی آئی۔ جیل میں اس نے اسلامی کتب کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس کے دل میں ایک ایسی شمع روشن ہو گئی کہ اس کی تمام وحشت جاتی رہی اور اس نے جیل ہی میں اسلام قبول کر لیا۔

قبول اسلام کے بعد جیل میں عبدالعزیز کی امن پسندی کے باعث اس کی سزا تین سال کم کر دی گئی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے کہا "مجھے رنگ سے باہر کم ہی خوشیاں ملی ہیں لیکن اب میں مطمئن ہوں اور کسی قسم کی بے سکونی میرے اندر نہیں۔ سکون حاصل کرنے میں اسلام نے میری بے حد مدد کی ہے"۔

25 مارچ 1995ء کی صبح جب عبدالعزیز آزاد دنیا میں قدم رکھ رہا تھا تو نئے جذبوں سے سرشار ایک مسلمان تھا۔ گزشتہ تین برسوں میں اس کے اندر حیرت انگیز انقلاب برپا ہوا تھا اور اس کا ظاہر و باطن بدل گیا تھا۔ اب مائیک ٹائی سن کہیں دور ماضی کے کھنڈروں میں دفن ہو چکا تھا اور ملک عبدالعزیز کی صورت میں ایک نیا انسان آ چکا تھا۔ رہائی کے بعد اس نے رنگ کی دنیا میں واپس آنے کے لیے پریکٹس شروع کر دی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا پہلا حریف پیٹر میک نیلی تھا اور اس مقابلے کو غیر معمولی اہمیت دی جا رہی تھی۔

19 اگست 1995ء کی رات لاس ویگاس کے ایم جی ایم گرینڈ گارڈن کے رنگ میں 16736 تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ رنگ بے پناہ روشنی میں ایسے چمک رہا ہے جیسے چاندی کا بنا ہو۔ ریفری مزلین رنگ میں داخل ہو کر رسوں کو کھینچ کر دیکھتا ہے کہ اتنے میں ایک جانب سے پیٹر میک نیلی رقص کرتا ہوا رنگ میں داخل ہوتا ہے۔ پھر ملک عبدالعزیز نماز والی ٹوپی پہنے بڑے اطمینان کے ساتھ سیاہ نیکر اور شرٹ میں ملبوس رنگ کی جانب بڑھتا ہے۔ رنگ کے ایک طرف کچھ افراد اس کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں کہ ہال میں شور بلند ہوتا ہے اور پورا ہال "تالی تالی" کے نعروں سے گونج اٹھتا ہے۔ اہل مغرب تعصب کی بنا پر ملک عبدالعزیز کہنا پسند نہیں کرتے۔ مقابلہ دیکھنے والوں میں ہالی وڈ کے اسٹار میڈونا، ایڈی مرفی اور بروس ولز بھی شامل ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ریفری مقابلہ شروع کرنے کا اعلان کرتا ہے اور دونوں حریف آمنے سامنے آ جاتے ہیں۔ پھر حریف ملک عبدالعزیز پر حملے شروع کر دیتا ہے اور یکے بعد دیگرے کئی مکے برساتا ہے، لیکن ایک بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ ملک عبدالعزیز اپنے حریف کو سامنے آنے پر ایک بائیں، دو دائیں، دو بائیں اور ایک اپر کٹ ضربیں لگاتا ہے جس سے میک نیلی گر پڑتا ہے اور اٹھتے ہی دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

جب وہ دوبارہ اٹھ کر سامنے آتا ہے تو لڑکھڑانے کی وجہ سے ٹھہر نہیں سکتا۔ عبدالعزیز دو مکے مزید مارتا ہے جس پر میک نیلی بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کا منیجر اسے عبدالعزیز کے حملوں سے بچا لیتا ہے۔ مقابلہ 89 سیکنڈ جاری رہتا ہے اور عبدالعزیز حریف کو پہلے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ریفری عبدالعزیز کے جیتنے کا اعلان کر دیتا ہے۔

عبدالعزیز کا یہ بارہواں مختصر ترین مقابلہ اور مجموعی طور پر 36 واں ناک آؤٹ تھا۔ اسے دو مکے مارنے کے ڈھائی کروڑ ڈالر جب کہ نیلی کو دو مکے کھانے کے 90 لاکھ ڈالر ملے۔ شائقین کو اس مقابلے کے بعد بہت حیرت ہوئی کیوں کہ کچھ شاید یہ اندازہ لگائے بیٹھے تھے کہ تین سال جیل میں رہنے کی وجہ سے اس کی قوت میں کچھ تو کمی آئی ہو گی لیکن اس کے برعکس تماشائیوں نے دیکھا کہ اس کی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔

مقابلہ جیتنے کے بعد عبدالعزیز نے اپنے انٹرویو میں کہا: "میک نیلی نے گھنٹی بجتے ہی مکے مارنے کی کوشش کی اور میں نے صرف اس کا دفاع کیا اور اسے زور سے نہیں مارا۔ میں حیران ہوں کہ وہ دوسرے مکے پر گر گیا۔ یقیناً یہ سب اسلام قبول کرنے کی برکت تھی"۔

آئیے دوست بنائیں

نام .... عمر ....

مشاغل ....

پتا ....

مہارت

عفت گل اعزاز

امی گھر میں داخل ہوئیں تو سارا گھر الٹ پلٹ ہوا تھا۔ کمرے میں ہر طرف چیزوں کا ڈھیر تھا۔ مریم کی کتابیں اور کاپیاں بکھری ہوئی تھیں اور مریم اپنی چھوٹی بہن سعدیہ کے ساتھ لڑنے میں مشغول تھی۔ جوتے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔

"اس نے مجھے مارا ہے" مریم نے سعدیہ کی چوٹی کھینچتے ہوئے کہا۔

"امی پہلے اس نے مجھے مارا تھا" سعدیہ نے روتے ہوئے بتایا۔ مریم اپنی کتابیں اکٹھی کرنے لگی۔

"بہت چلاؤ نہیں کیونکہ ذرا تمیز نہیں ہے تمہیں۔ تھوڑی دیر کو میں باہر گئی ہوں اور تم نے سارے گھر میں تباہی مچادی" وہیں تم سے کہہ گئی تھی کہ دال اور چاول صاف کر کے رکھنا میں آکر کھچڑی بنادوں گی۔ صاف کیے چاول؟"

"میں نے نہیں کئے" مریم نے جواب دیا۔

"بہت کام چور لڑکی ہے۔ مجال ہے جو کبھی کوئی کام کرے" امی نے غصے سے کہا۔

"چلو، سعدیہ کمرہ صاف کرو۔ یہ سارے کپڑے اور جوتے ہٹاؤ یہاں سے"

سعدیہ جلدی جلدی کمرہ صاف کرنے لگی۔ امی نے ڈبے میں سے چاول ایک ٹرے میں نکالے اور انہیں بیننے لگیں۔ "اگر تم نے دال اور چاول صاف کر کے رکھے ہوتے تو میں فوراً کھچڑی پکانے رکھ دیتی۔ اب اتنی دیر ہو جائے گی۔ تمہارے ابو آئیں گے اور کھانا اس وقت تک تیار نہیں ہوگا۔ اپنے اندر ذمہ داری پیدا کرو۔ اتنی بڑی ہو گئی ہو!" امی نے مریم سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ابو آگئے۔ وہ دوپہر کو کھانا کھانے کے لیے تھوڑی دیر کو روزانہ گھر آتے تھے اور کھانا کھا کے دوبارہ کام پر چلے جاتے تھے۔

"کھانا تیار ہے؟" انہوں نے آتے ہی پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر لگے گی" امی نے کہا "بس ذرا دیر رک جائیں"

"نہیں مجھے جلدی ہے۔ میں جا رہا ہوں" انہوں نے کھڑے کھڑے کہا۔

"تھوڑی دیر رک جایئے" امی نے دوبارہ کہا۔

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ضروری کام ہے مجھے" وہ یہ کہہ کر تیزی سے دروازے کی طرف چلے گئے۔ امی کو بہت افسوس ہوا۔

مریم نے پہلے بھی امی سے کئی بار کہا تھا کہ اس کی اسکول کی

وردی بہت پرانی اور بد رنگ ہو گئی ہے۔ انہوں نے غصے سے کہا کوئی وردی نہیں ملے گی اسی وردی پر گزارا کرو!"

درحقیقت مریم بہت کام چور لڑکی تھی' امی اس سے جب بھی کسی کام کے لیے کہتیں وہ ہمیشہ ٹال مٹول کر جاتی' اگر کبھی کام کرنا ہی پڑ جاتا تو اسے خراب طریقے سے کرتی کہ دوبارہ اسے کوئی کام کہنے کو دل نہ چاہتا۔ اس کی امی اسے بار بار سمجھاتی تھیں کہ اس طرح وہ اپنا بھی نقصان کر رہی ہے اور دوسروں کا بھی لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتی۔ اگر گھر کی صفائی کرنی ہوتی تو جگہ جگہ کوڑا پڑا رہ جاتا۔ میز کرسیوں پر گرد و غبار جما رہتا۔ برتن کمرے میں پڑے رہتے۔ گھر کا تمام کام امی ہی کرتی تھیں۔ مریم صبح دیر سے اٹھتی۔ امی ناشتہ تیار کرتیں اور مریم ناشتہ کر کے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کو واپس آتی تو کھانا تیار ملتا۔ وہ بستر پر لیٹ کر آرام کرتی۔ شام کو اٹھ کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ جاتی۔ امی کسی کام کے لیے آواز دیتیں تو وہ یہ کہہ کر صاف انکار کر دیتی "میں کھیل رہی ہوں!"

امی کو یہ جواب بہت ناگوار گزرتا۔ اکثر وہ سمجھاتیں بھی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ کبھی کبھار اس کی امی نے اس کے ابو سے شکایت بھی کی۔ وہ بھی اسے سمجھاتے لیکن وہ کسی کی نہ سنتی۔

کچھ دنوں سے امی کی طبیعت خراب تھی۔ ان کے دائیں پاؤں میں گلٹی بن گئی تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں کچھ دوائیاں دیں' لیکن ان دوائیوں سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ گلٹی درد بھی کرتی تھی اور انہیں چلنے پھرنے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ امی بہت پریشان تھیں مگر تکلیف کے باوجود کام کرتی رہتیں۔ اور مریم کسی کام میں ان کا ہاتھ نہ بٹاتی۔ اس طرح پاؤں کی گلٹی اور زیادہ بڑھ گئی اور اب اس میں مسلسل درد رہنے لگا۔ ایک صبح ابو امی کو ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے گلٹی کا آپریشن کروانے کا مشورہ دیا اور وارڈ میں داخل کر لیا۔ مریم اور سعدیہ گھر پر تھیں۔ چھوٹا بھائی ساجد اسکول گیا ہوا تھا۔ امی کے جانے کے بعد گھر بہت خاموش اور ویران لگ رہا تھا۔ مریم بہت پریشان تھی۔ اس کا دل چاہا کہ امی کو واپس بلا لے۔

دو گھنٹے کے بعد ابو گھر آئے۔ وہ بہت فکر مند تھے۔ تمہاری ماں بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے جلد از جلد خون کا بندوبست کرو۔ تم لوگ گھر پر ہی رہنا اور گھر کا خیال رکھنا' مجھے شاید دیر ہو جائے!" یہ کہہ کر ابو چلے گئے اور سعدیہ نے گھر کا بیرونی دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ ایک طرف بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ جب کسی کے جسم میں خون کی بہت کمی ہو جائے تو اسے خون دیا جاتا ہے اور آپریشن میں تو لوگ مر بھی جاتے ہیں۔ "ہائے کہیں میری امی" ۔۔۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب خیال آ رہے تھے "اللہ میاں میری امی جان کو بچا لے۔ ان پر رحم کرنا!"

سعدیہ بھی اداس تھی۔ دوپہر ہوئی تو ساجد اسکول سے گھر آیا۔ اس نے کھانا مانگا۔ مریم نے دیکھا ڈلیا میں صبح کے بچے ہوئے چند پراٹھے رکھے تھے۔ سعدیہ اور ساجد نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ابو گھر نہیں آئے تھے۔ شام ہو گئی۔ مریم کو امی کی بہت فکر تھی۔ سعدیہ اور ساجد نے اس سے کہا کہ کھانا پکائے۔ مریم نے روٹیاں پکائیں' روٹیاں ٹیڑھی تھیں اور کہیں سے جلی ہوئی تھیں تو کہیں سے کچی۔

"یہ کیسی روٹی ہے؟" ساجد نے غصے سے کہا۔

"مجھے بس ایسی ہی روٹی پکانی آتی ہے۔ کھانی ہے تو کھاؤ نہیں کھانی تو نہ کھاؤ!" مریم نے روکھے پن سے کہا۔

"روٹی ذرا اچھی بناؤ نا!" سعدیہ نے کہا تو مریم نے اسے ایک تھپڑ مارا۔ دونوں بہنیں لڑنے لگیں۔ آٹا بھی بکھر گیا۔ عین اسی وقت ابو گھر میں داخل ہوئے۔ سعدیہ نے روتے ہوئے ابو سے مریم کی شکایت کی۔ ابو نے مریم کو خوب ڈانٹا "تمہیں چھوٹی بہن کا خیال رکھنا چاہیے۔ مارا کیوں اسے؟ تم ان میں سب سے بڑی ہو۔ تمہاری امی گھر پر نہیں ہیں' تمہیں چھوٹے بھائی اور بہن کا خیال رکھنا چاہیے!"

مریم بہت شرمندہ ہوئی۔ پھر ابو نے بتایا کہ امی کا آپریشن ہو گیا ہے اور انہیں ہسپتال میں داخل کر لیا گیا ہے۔ مریم اگلے دن صبح اسکول چلی گئی۔ ساجد بھی اسکول چلا گیا۔ گھر پر سعدیہ اکیلی تھی۔ مریم دوپہر کو اسکول سے آئی تو وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔

"مریم کھانا پکاؤ مجھے بھوک لگی ہے!" سعدیہ نے مریم سے

کہا۔ ساجد بھی اسکول سے آیا اور کھانا مانگنے لگا۔

"پھر میں کیا کروں تمہاری بھوک کا۔ میں نہیں پکاتی کھانا جاؤ یہاں سے' میں کوئی نوکر تھوڑی ہوں!" مریم نے ان دونوں کو جھڑک دیا۔

"ابو آئیں گے تو میں انھیں بتاؤں گا کہ مریم نے روٹی نہیں پکائی" ساجد نے کہا۔

"ہاں ہاں جاؤ ابھی جا کر کہ آؤ۔ میں نہیں ڈرتی کسی سے!"

"کل بھی انھوں نے کہا تھا کہ تم اپنی بہن اور بھائی کا خیال رکھنا!" سعدیہ نے ابو کی بات اسے یاد دلائی۔ مگر مریم نے پرواہ نہ کی اور دونوں بچے بھوکے ہی بیٹھے رہے۔

شام ہوئی تو مریم نے الٹا سیدھا کھانا پکایا۔ شام کو ابو آئے تو انھوں نے دیکھا۔ باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر تھا۔ کمرے پر کپڑے پڑے تھے۔ کمرا بھی گندا تھا۔ "یہ گھر کیوں گندا پڑا ہے!" ابو نے پوچھا۔

"ابو یہ سعدیہ صفائی نہیں کرتی۔ اس نے میرے ساتھ لڑائی بھی کی تھی" مریم نے کہا۔

"ابو ہم نے دوپہر کھانا بھی نہیں کھایا" سعدیہ نے کہا۔

"ابو' مریم تو دوپہر کو سو گئی تھی اور اس نے کھانا نہیں پکایا" ساجد نے کہا۔

مریم کو ابو سے خوب ڈانٹ پڑی۔ "تم کل سے اسکول نہیں جاؤ گی۔ چھٹی کرو اور گھر کے کام کیا کرو۔ تمہارا اسکول جانا آج سے بند" ابو نے کہا۔

مریم کچھ بھی نہ کر سکی۔

"جب تک تمہاری امی ٹھیک نہیں ہو جاتیں' سب کام تمہیں کرنے ہیں۔ کل یہ سارے میلے کپڑے دھونا' گھر صاف کرنا اور ہاں کھانا بھی جلدی پکایا کرو۔ آئندہ میں تمہاری کوئی شکایت نہ سنوں!" ابو نے غصے سے کہا" ذمہ داری سے کام کرو! تمہاری عمر کی لڑکیاں نے تو سارا گھر سنبھالا ہوتا ہے"۔

"اچھا" مریم نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ لوگ سے کام کاج میں لگ گئی۔ امی کا آپریشن ہوا۔ وہ آٹھ دن ہسپتال میں رہیں۔ گھر واپس آئیں تو ابھی چل پھر نہیں سکتی تھیں۔ مریم نے اپنی امی کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ زندہ سلامت گھر آ گئیں۔ مریم نے اب گھر کا کام خوب دل لگا کر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اسکول جائے اور سب لڑکیوں کی طرح علم حاصل کرے۔ گلی میں سے صبح اور دوپہر اسکول کے بچے گزرتے۔ وہ اپنے کندھوں سے اسکول کے بستے لٹکائے ہوئے ہوتے۔ مریم کو ان بچوں پر بڑا رشک آتا۔

اسے ابو سے اسکول جانے کی اجازت مانگنے کی ہمت نہ پڑتی۔ ایک دن اس نے امی سے کہا کہ وہ اسکول جانا چاہتی ہے وہ ابو سے اجازت لے دیں"۔

امی نے کہا "ابھی تو میں کام نہیں کر سکتی۔ تم اسکول چلی گئی تو گھر کے کام کون کرے گا؟"

"امی' پیاری امی! میں گھر کے سب کام بھی کر لوں گی۔ بس مجھے اسکول جانے دیں" مریم نے امی کی منت سماجت کی۔ امی نے مناسب موقع دیکھ کر ابو سے بات کی مگر ابو خاموش رہے!

ایک دن اس کے اسکول کی سہیلیاں کشور اور صائمہ اس سے ملنے آئیں۔ "مریم' تم اسکول کب آؤ گی؟" انھوں نے پوچھا

"اس نے اسکول چھوڑ دیا ہے۔ مس سے کہہ دینا!" مریم ابھی خاموش تھی کہ سعدیہ نے کہا۔

"تم کیوں بول رہی ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو!" مریم نے سعدیہ کو ڈانٹا۔ اس نے کشور سے چپکے سے کہا کہ وہ مس کو بتا دے کہ اس کی امی بیمار ہیں اس لیے ابھی وہ نہیں آ سکتی اسے ایک مہینے کی چھٹی دے دیں۔ پھر اسے تاکید کی کہ وہ گھر آ کر اسے ضرور بتائے کہ مس نے کیا جواب دیا مگر اس سارے معاملے کا کسی کو پتہ نہ چلے!"

"تمہارے ابو نے تمہیں اسکول جانے سے روکا کیوں ہے؟"

"بس گھر میں کام جو ہے! امی تو بیمار ہیں ناں۔ میں نے گھر سنبھالنا ہوتا ہے!"

"تم اسکول سے آ کر بھی کام کر سکتی ہو اور صبح اٹھ کر بھی کام کر سکتی ہو۔ میں بھی اپنے گھر میں سارا کام کرتی ہوں اور پڑھتی بھی ہوں" کشور نے بتایا۔

"بس مجھ سے غلطی ہوئی میں کام سے دور بھاگتی تھی۔ لہٰذا

اب مجھے کام کرنے کی عادت نہیں ہے۔ امی ابو نے بس بھلا سب کو
کی شکایت تھی کہ یہ کام چور ہے۔"
"تم اگر ذمہ داری سے سارے کام سنبھال لیتیں تو ابو کو
شکایت نہ ہوتی اور وہ تمھیں اسکول جانے سے منع نہ کرتے" صائمہ
نے کہا۔
"ہاں شاید تم ٹھیک کہتی ہو!" مریم نے کہا "بس کہیں میرا
نام ہی نہ کٹ جائے" وہ فکرمندی سے بولی
"تم پریشان نہ ہو۔ ہم مس سے تمھارے لیے بات ضرور
کریں گے" اشتو نے کہا۔
"چلو اب گھر کا کام خوب دل لگا کر کرو۔ یہ کام تو ہر لڑکی کو
کرنے چاہئیں۔ ہم لوگ ابھی دنوں کا حساب تمھیں بتائیں گے تو کون
بتائے گا" صائمہ بولی۔
"ہاں واقعی!" مریم بولی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں لڑکیاں چلی
گئیں۔ مریم اب بہت توجہ اور ذمہ داری سے سارے کام کرتی۔
وقت پر کھانا تیار کرتی۔ امی بستر پر بیٹھے بیٹھے اس کے کام میں مدد
کر دیتیں۔ سعدیہ بھی ساتھ میں کام کراتی۔ اب عابدہ کو بھی کوئی
شکایت نہ تھی۔ نہ سعدیہ سے لڑائی ہوتی۔ امی بھی اسے دعائیں
دیتیں اور ابو بھی اپنی بچی سے خوب پیار کرتے۔ رفتہ رفتہ امی کی
طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔
"امی مجھے اسکول کب جانے دیں گی؟" مریم نے امی سے
پوچھا۔
"اچھا۔ میں تمھارے ابو سے پوچھوں گی!"
"امی میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ گھر کے کام بھی ذمہ داری
سے کروں گی۔ اب تو مجھے گھر کا کام کرنے کی عادت ہو گئی ہے اس
لیے مجھے کام کرتے ہوئے کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ تو بہ ہوا؟
ہے" مریم بولی۔ اتنے میں ابو گھر میں آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک
بڑا سا تھیلا تھا۔ انھوں نے تھیلا مریم کو پکڑا دیا۔
"یہ بہت اچھی بات ہے کہ مریم کو پڑھنے کا شوق ہے۔ بیٹی
کل سے تم اسکول جاؤ گی۔ دیکھو میں تمھارا نیا یونیفارم لایا ہوں اور
بستہ بھی اور میری ڈائری بھی۔ قلم پنسل، کتابوں کی کتابیں اور مٹھائی
بھی۔ تم سب لوگ مٹھائی کھاؤ!"
مریم کے چہرے پر
مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "شکریہ
ابو! آپ کتنے اچھے ہیں!"
"ابو! امی کے صحت یابی
کی خوشی میں مٹھائی لائے ہیں
نا؟" سعدیہ نے پوچھا۔
"ہاں بیٹا!"
"اور اس خوشی میں
بھی کھاؤ کہ میری پیاری بچی
مریم نے اب خانہ داری میں
مہارت حاصل کر لی ہے" امی
نے یہ کہہ کر مریم کو گلے سے
لگا لیا۔

آپ کا خط ملا

اکتوبر کا شمارہ بہت شان دار تھا۔ تمام کہانیاں، نظمیں اور مضامین اچھے تھے خصوصاً لیاقت علی خان کے بارے میں تحریر بہت زبردست تھی۔ بلا عنوان کا سلسلہ ختم کر کے مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں۔ آیئے دوست بنایئے میں کلر تصاویر شائع کریں۔ (محمد احتشام چودھری، فیصل آباد)

اکتوبر کا تعلیم و تربیت پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے ہمارے لیے اپنے دروازے پر "نو لفٹ" کا بورڈ لگوا رکھا ہے۔ پلیز اس بورڈ کو اب اتار دیجیے اور اس دفعہ ہمیں دل سے خوش آمدید کہیں۔ تعلیم و تربیت میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے وہ کہانیوں کے ساتھ شائع ہونے والے اسکیچ ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کے مصوروں دن دگنی رات چگنی ترقی کریں۔ (شمس القمر عاطف خٹک)

بھائی جان! میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ آیئے دوست بنایئے میں بلیک اینڈ وائٹ تصویروں کی جگہ رنگین تصویریں دیں۔ (سلمان محمود، کراچی)

اس ماہ کا سرورق بہت خوب صورت لگا۔ اب آپ تعلیم و تربیت کا شرارتی نمبر شائع کریں۔ (طیبہ زبیر، ملک وال)

سب تحریریں معیاری تھیں۔ خاص طور پر "سردار بجلی والا"، "شریف بدمعاش" اور "بے تیغ سپاہی" بہت پسند آئیں۔ شرارتی لکیروں کا سلسلہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ لطیفے بھی مزے دار تھے۔ (محمد افضل انجم، چونیاں)

یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہمارا پیارا رسالہ تعلیم و تربیت پھر پاکستان بھر کے بچوں کے رسائل میں اول آیا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ خاص طور پر "شریف بدمعاش" اور "ایک بے تیغ مجاہد" بہت دل چسپ تھیں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ کہانیوں کی دنیا ختم کر کے باتیں بڑوں کی کا سلسلہ شروع کریں۔ (سارہ وقار، راول پنڈی)

اس مہینے کا رسالہ بہت زبردست تھا۔ تمام کہانیاں بہت دل چسپ تھیں اور نظمیں بھی مزے دار تھیں۔ اب آپ قلمی دوستی کا سلسلہ چار رنگوں میں کریں۔ (شیر نواز گل، ارٹیالیاں)

میرا دل مراد سرا، رسالہ ایک قابل تعریف کہانی تھی۔ ایک بے تیغ مجاہد "لیاقت علی خان" مضمون قابل تحسین ہے۔ آپ بھی لکھنے میں نو آموز لکھاریوں کی غلطی اچھی کلو شیں تھیں۔ عظیم کے بارے میں بھی کافی معلوماتی مضمون تھا۔ سے پڑھنے والوں کے لیے قائد اعظم کا اسکی کی پچھلی اقساط کا خلاصہ بھی تحریر کیا کریں۔ (عمران شریف خان، کراچی)

بھائی جان! صفحہ نمبر 9 پر مصور نے دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کی تصویر بنائی ہے۔ یہاں دو لڑکوں اور ایک لڑکی کی تصویر ہونی چاہیے تھی۔ صفحہ نمبر 36 پر علمی آزمائش کے کوپن پر آخری تاریخ 7 ستمبر لکھی ہے۔ اسے 17 اکتوبر ہونا چاہیے تھا۔ (محمد غفران، لاہور)

یہ پڑھ کر کہ آپ بھی لکھنے میں شائع ہونے والی تحریروں کی مالیت بڑھا دی گئی ہے بہت خوشی ہوئی۔ شکر ہے آپ کو ہمارا بھی خیال آ گیا ہے۔ اس دفعہ تمام کہانیاں شان دار تھیں۔ لیکن پہلا ان نمبر ون تھی۔ ایک بے تیغ مجاہد پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ (حبیب زاہد، لاہور)

آپ تعلیم و تربیت میں راستہ تلاش کیجیے شائع کیا کریں اور تعلیم و تربیت کے صفحات بڑھا دیں۔ بے شک قیمت 16 روپے کر دیں۔ (محمد عاصم بھٹہ، منڈی بہاء الدین)

داؤدی علمی آزمائش کے کوپن میں مقام اور پتا الگ الگ لکھا ہوا ہے۔ ان میں کیا فرق ہے؟ (عشرت سلطان، لاہور)

☆ مقام سے مراد وہ شہر یا گاؤں ہے جہاں آپ رہتے ہیں اور پتا سے مراد خط و کتابت کے لیے آپ کے گھر کا پورا پتا۔

پلیز بلا عنوان کا کارٹون آسان دیا کریں۔ اس کے علاوہ آپ ہمیں تعلیم و تربیت کے دفتر کی سیر بھی ضرور کروائیں۔ اس دفعہ کے "دل چسپ اور ناقابل یقین" میں ستارہ مچھلی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ "اگر ہم اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں تو ہم اس کے جتنے ٹکڑے کریں گے ان ٹکڑوں سے اتنی ہی نئی ستارہ مچھلیاں بن جائیں گی" یہ غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اگر ستارہ مچھلی کا کوئی بازو کسی بھی وجہ سے کٹ یا ٹوٹ جائے تو وہ اسے دوبارہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ (زیست منیب عمیر، لاہور)

اکتوبر کا ایک ساتھ تعلیم و تربیت پڑھا۔ کہانیوں میں سید نظر زیدی کی "سردار بجلی والا"، اشفاق احمد خان کی "شریف بدمعاش"، "تجمہ معراج کی "زیور کا زیور" پسند آئیں اور نظموں میں "اے لیاقت علی" پسند آئی۔ (افتخار احمد خان، گوجرانوالہ)

اس دفعہ کا رسالہ نمبر ون تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں لیکن "شریف بدمعاش" سب سے نمبر لے گئی۔ بھائی جان! بلا عنوان ختم کر دیں اور اس کی جگہ مجرم کون شروع کریں۔ (آمنہ مسعود، اسلام آباد)

اکتوبر کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ روبنسن کروسو کی آخری قسط بہت شان دار رہی۔ کہانیوں میں سردار بجلی والا، شریف بدمعاش اور ایک بے تیغ مجاہد پسند آئیں (اسد اللہ خان یوسف زئی)

بھائی جان! آپ نے دوست بنائیں کی جگہ لڑکیوں کے لیے بھی کوئی سلسلہ شروع کریں (سعدیہ محفوظ رحمان لاہور)

اکتوبر کا تعلیم و تربیت ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا لیکن ٹائٹل زیادہ پسند نہ آیا۔ کہانیوں میں "پہلا دن" اور "[illegible]" نمبر لے گئیں۔ انعامات کی مالیت بڑھانے پر خوشی ہوئی۔ "بلاعنوان" کا مزا نہیں آیا۔ عمیر انور نے آپ نے دوست بنائیں کے بارے میں جو تجویز پیش کی ہے وہ خاصی معقول ہے۔ چار رنگوں میں یہ سلسلہ اچھا لگے گا اور رسالے کی خوب صورتی میں مزید اضافہ ہو گا۔ "ایک بے تیغ مجاہد" جیسی کہانیاں نئی نسل کے لیے بہت ضروری ہیں تاکہ ہم لوگ ان عظیم مجاہدین کے نقش قدم پر چل کر اپنے وطن کا نام روشن کر سکیں (ثمرین لطیف لاہور)

اکتوبر کا رسالہ بہت جلد ملا۔ سرورق دیکھ کر میرا دل کھل اٹھا۔ بلاشبہ یہ تعلیم و تربیت کا بہترین سرورق تھا۔ ہر کہانی سپرہٹ تھی۔ اب آپ تعلیم و تربیت کا خوف ناک نمبر شائع کریں (غلام مرتضیٰ علوی گوجرہ)

اکتوبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ سرورق خاص نہ تھا۔ اگر تعلیم و تربیت کو ملنے والی شیلڈ کو سرورق بناتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ "پہلا دن" اور "شریف بدمعاش" دل چسپ کہانیاں تھیں (ظہیر عباس کشمیری احمد امیر علی شاہ)

تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ لیکن شریف بدمعاش، سردار بجلی والا، پہلا دن اور ایک بے تیغ مجاہد کا جواب نہیں (محسن جمشید راؤ لاہور)

پچھلے چند سال سے میرا "تعلیم و تربیت" سے واسطہ پڑا۔ پھر باقی سب رسالوں اور ناولوں کو چھوڑ کر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ہمارے سب گھر والوں کی پسند کا رسالہ بھی یہی ہے اور ہر ماہ اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے (محمد عبداللہ سلیم فیصل آباد)

سرورق اس قدر شان دار تھا کہ دل خوش ہو گیا۔ اس ماہ بلکہ ہر ماہ ہی کہانیاں بہت شان دار ہوتی ہیں۔ اس بار جو کہانیاں زیادہ پسند آئیں وہ پہلا دن، شریف بدمعاش اور سردار بجلی والا ہیں۔ پہلے ہماری امی رسالہ پڑھنے پر بہت خفا ہوتی تھیں لیکن اب وہ خود بھی اسے نہایت شوق سے یہ رسالہ پڑھتی ہیں (افضل سراج اوکاڑہ)

ٹائٹل دیکھ کر رسالہ خرید لیا۔ یہ تو ہمیں بعد میں دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ جتنا باہر سے خوب صورت ہے اتنا ہی اندر سے بھی ہے۔ یہ اپنے نام کی طرح واقعی بچوں کی تربیت کرتا ہے (ثاقب شیراز کراچی)

محترم ادیب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں پاکستانی نہیں ہوں البتہ میں پاکستان میں کئی سالوں سے مہمان ہوں۔ میرے وطن کا نام کردستان ہے۔ میں سات سالوں سے پاکستان میں رہ رہا ہوں اور اردو سیکھنے کے لیے میں نے ہر مہینے باقاعدگی سے تعلیم و تربیت کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں پاکستانی نونہالوں کے ساتھ مل کر اس وطن کی ترقی کے لیے جدوجہد کروں۔ (آکو دراں کردش، راول پنڈی)

اکتوبر کا رسالہ پڑھا۔ دلی خوشی ہوئی۔ تمام کہانیاں خوب سے خوب تر تھیں۔ ڈاکٹر رضوان ثاقب کی کہانی "ایک بے تیغ مجاہد" سے ہماری معلومات میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔ نظمیں بھی نہایت اچھی تھیں۔ باکسنگ کے عالمی چیمپئن محمد علی کے کارنامے پڑھ کر جو خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے۔ تمام پاکستانیوں کو ان پر فخر ہے۔ قلمی دوستی میں شائع ہونے والی تصویروں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ رنگین شائع کی جائیں (اشفاق احمد، ڈیرہ اسماعیل خان)

اکتوبر کا شمارہ بہت ہی اچھا تھا۔ سرورق تو نہایت ہی خوب صورت تھا۔ کہانیوں میں شریف بدمعاش اور سردار بجلی والا بہت اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ لطیفے بھی خوب تھے۔ ہمارا پیارا ماہنامہ دن بہ دن جدید سے جدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لیے یہ ہمارا محبوب رسالہ بن گیا ہے (خادم حسین کاہنہ نو)

اکتوبر کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ کہانیوں میں "سردار بجلی والا" "پہلا دن" اور "شریف بدمعاش" بہت پسند آئیں مگر "ایک بے تیغ مجاہد" اس دفعہ پھر نمبر ون رہی۔ میری رائے ہے کہ "بلاعنوان" کا سلسلہ ختم کر دیں کیوں کہ اب یہ بور ہوتا جا رہا ہے (شہریار زیب لاہور)

آپ کا خط ملا۔ آصف اعظم کے خط میں انہوں نے لکھا ہے "تعلیم و تربیت پاکستان کا سب سے بہترین رسالہ ہے"۔ میرے خیال میں یہ بالکل غلط ہے۔ انہیں یوں لکھنا چاہیے تھا "تعلیم و تربیت دنیا کا سب سے بہترین رسالہ ہے"۔ لہٰذا آپ ہی اس لائن کو درست کر دیتے (عطیہ ہاشمی راول پنڈی)

اکتوبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ سرورق بالکل سادہ تھا جو بالکل پسند نہ آیا۔ کہانیوں میں سردار بجلی والا، شریف بدمعاش اور مراد ول مراد پسند آئیں (ایم زید سلیم میاں چنوں)

تعلیم و تربیت کا سرورق ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی جگ مگا رہا تھا۔ اس مرتبہ کی خوش خبری واقعی خوش خبری تھی۔ کہانیوں میں ایک بے تیغ مجاہد اور شریف بدمعاش اچھی لگیں (محمد یوسف ظفر آباد رحیم یار خان)

اس ماہ کا تعلیم و تربیت ستمبر کی 29 تاریخ کو مل گیا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں لیکن پہلا دن اور شریف بدمعاش بہت پسند آئیں۔ روبنسن کروسو ختم ہو گیا اب دوسرے نئے ناول کا انتظار ہے (عدنان شیروانی راول پنڈی)

اکتوبر کا شمارہ امید کے عین مطابق لاجواب تھا۔ قائد اعظم [illegible] بہترین جا رہا ہے۔ تمام کہانیاں متاثر کن تھیں۔ بھائی جان "بلاعنوان" میں انعامات بھی علمی آزمائش کی طرح زیادہ سے زیادہ بچوں میں تقسیم کیا کریں (ظفر سلیم مجاہد سلیم راول پنڈی)

میرا یہ 20 واں خط ہے۔ 19 کو تعلیم و تربیت میں جگہ نہ مل سکی۔ اس بار سرورق زیادہ اچھا نہ تھا۔ لطیفے بہت ہی خوب تھے (محمد ضمیر اعظم، حافظ آباد)

میری عمر نو سال ہے اور جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس وقت سے میرے گھر میں تعلیم و تربیت آرہا ہے۔ اکتوبر کے تعلیم و تربیت کا سرورق بہت پسند آیا۔ ویسے تو پورا تعلیم و تربیت ہی اپنی مثال آپ تھا لیکن ایک بے تیغ مجاہد اور پہلوان کی تو کیا بات ہے۔ شرارتی لکیریں اچھا سلسلہ ہے اسے جاری رکھیں۔ آپ توقف ٹاک نمبر کب شائع کریں گے؟ (علی اختر، بہاول نگر)

پہلوان اور شریف بدمعاش نے بہت متاثر کیا۔ ہونہار ادیبوں میں انعام کی مالیت اکٹھی کرنے پر بڑی خوشی ہوئی (محمد عارف قریشی، واہ کینٹ)

تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ آپ نظمیں بہت کم شائع کرنے لگے ہیں۔ ان کی تعداد میں اضافہ کریں اور کھیلوں کی دنیا ختم کر کے لڑکیوں کے لیے ایک الگ سلسلہ شروع کریں۔ انعامی خط بھی شروع کریں۔ قائداعظم کامک بہت اچھا سلسلہ ہے اس سے قائداعظم کے بارے میں ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو پہلے معلوم نہیں تھیں (رابعہ صدف، ملتان)

کھیلوں کی دنیا اور قائداعظم کامک اچھے سلسلے ہیں۔ قائداعظم کامک کی طرح علامہ اقبال کامک بھی شروع کریں (آصف اللہ، کوئٹہ)

اکتوبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تعلیم و تربیت واقعی ایک اعلیٰ رسالہ ہے۔ بلاعنوان کی جگہ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں (راحیلہ قیصر جلیل، اسلام آباد)

اس دفعہ کا شمارہ ہماری سوچ سے بڑھ کر اچھا تھا۔ ٹائٹل لاجواب تھا۔ کہانیاں شریف بدمعاش اور شکست لاجواب تھیں (احتشام تقوی، واہ چھاؤنی)

تعلیم و تربیت کے سرورق سے پتہ چل رہا تھا کہ اس میں مزے مزے کی کہانیاں ہوں گی۔ ہمیشہ کی طرح ہماری خواہشات پر پورا اترا۔ پلیز مجرم کون؟ اور شعر و شاعری کا سلسلہ شروع کریں۔ اس دفعہ ساری کہانیاں ہی اچھی تھیں کسی ایک کی تعریف کریں تو باقی کہانیوں سے زیادتی ہوگی البتہ تصویروں پر ذرا توجہ دیں۔ صفحہ نمبر 11 پر جو بچے کھڑے ہیں یوں لگ رہا ہے کہ انہوں نے شلوار نہیں پہنی ہوئی (نائلہ محفوظ کیانی، راولپنڈی)

آپ بھی لکھئے میں شمارہ نمبر ... عبدالحلیم کی کہانی شاباش بچو نقل شدہ ہے۔ ثبوت کے طور پر تراشہ ساتھ ارسال کر رہی ہوں (صبا توفیق، لاہور)

* مذکورہ ممبر کو بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے اب ان کی کوئی تحریر تعلیم و تربیت میں شائع نہیں ہوگی۔ (ادارہ)

اکتوبر کا سرورق بالکل اچھا نہیں لگا تیز شوخ رنگ اچھے نہیں لگتے۔ روبن سن کروسو ختم ہو گیا ہے اور اب نئے ناول کا شدت سے انتظار ہے۔ بھائی جان! بلاعنوان بہت مشکل ہوتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں پڑتا۔ اس کی جگہ بیت بازی شروع کریں۔ کارٹون، نمتی یا شرارتی لکیروں میں سے صرف ایک کو جاری رکھیں (زاہد عباس، پیپلاں)

اکتوبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ ایک بے تیغ مجاہد اچھا مضمون تھا۔ بلاعنوان کو ختم کر کے "مجرم کون؟" کا سلسلہ شروع کریں (محمد عمران اقبال صدیقی، میرپور خاص)

آیئے دوست بنائیں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ تصویریں رنگین شائع کریں (مہتاب فاطمہ، اوکاڑہ)

اکتوبر کا چلتا ملتا تعلیم و تربیت ملا۔ سرورق قابل دید تھا۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ دل چسپ اور ناقابل یقین بہت دل چسپ اور ناقابل یقین ہوتا جا رہا ہے۔ آیئے دوست بنائیں میں چار رنگوں کی تصویر شائع کریں (مدثر حسن، جلال پور پیر والا)

اکتوبر کا تعلیم و تربیت بہت اچھا لگا۔ خاص کر پہلوان، سائنس فکشن، ایک بے تیغ مجاہد۔ روبن سن کروسو کی آخری قسط بھی بہت دل چسپ رہی۔ دوسری انگوٹھی کا انتظار رہے گا۔ لطائف اور دل چسپ و عجیب بھی بہت اچھے تھے۔ ہم سب بہن بھائی تعلیم و تربیت باقاعدگی سے پڑھتے ہیں (قاضی غلام غضنفر، راجن پور)

اکتوبر کے تعلیم و تربیت کا سرورق اپنے پرانے انداز میں تھا۔ جی جناب! بالکل اسی طرح کا سرورق ہونا چاہیے۔ "اے لیاقت علی" نظم پڑھ کر جوش و جذبہ دریائے سندھ کی طرح جوش مارنے لگا۔ "سردار چکی والا" کہانی اے ون تھی۔ باقی کہانیوں میں پہلوان، شریف بدمعاش، مراد دل مراد بہت پسند آئیں۔ روبن سن کروسو کا اختتام پڑھ کر آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ آخر 10 مہینے کا ساتھ تھا۔ قائداعظم کامک کے صفحات بڑھائیں (حسن اکبر، امیر علی پیپلاں)

تعلیم و تربیت ہمیں ہر ماہ کوئی نہ کوئی خوش خبری سناتا ہے۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ بھی لکھئے میں انعامات کی مالیت بڑھا دی گئی ہے۔ اس ماہ کہانیوں میں پہلوان، شریف بدمعاش اور مراد دل مراد پسند آئیں۔ جب کہ روبن سن کروسو کی آخری قسط بھی پسند آئی۔ انکل! اب اس کی جگہ کوئی جاسوسی ناول شروع کریں (محمد اطہر زیدی، بلوچستان)

اس دفعہ تعلیم و تربیت پہلے سے بھی خوب تھا۔ سرورق بھی بہت اچھا تھا۔ اشفاق احمد خاں کی کہانی شریف بدمعاش، جنت رسائی کی کہانی پہلوان اور سید نظر زیدی کی کہانی سردار چکی والا بہترین تھیں۔ ایک بے تیغ مجاہد پورے رسالے میں سب پر حاوی تھی۔ نظموں میں اے لیاقت علی بہت اچھی تھی (صفوان صادق، رحیم یار خان)

کہانیوں میں سردار چکی والا اور شریف بدمعاش بہت پسند آئیں۔ قائداعظم کامک بہت ہی اچھا سلسلہ ہے جس سے ہمیں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں (مدثر جلیل عباسی، رحیم یار خان)

کہانیوں میں پہلوان اور شریف بدمعاش بہت پسند آئیں۔ سائنس فکشن لاجواب تھا۔ روبن سن کروسو کی آخری قسط بہت اچھی رہی۔ تعلیم و تربیت کا معیار روز بروز بڑھ رہا ہے (محمد توصیف اسلم، صادق آباد)

قائداعظم کی ہوم رول لیگ میں شمولیت

قائد اعظم جیسے رہنما کی وفات کے بعد چند سال تک سیاسی خلا کو پر کرنے کے لیے مسز اینی بیسنٹ نے اپنی صدارت میں 1917ء میں ہندوستان میں ہوم رول لیگ کے نام سے ایک تحریک قائم کی جس کی عوام میں مقبولیت سے خوفزدہ ہو کر حکومت نے مسز بیسنٹ کو گرفتار کر لیا۔ قائد اعظم کو اس عوامی رہنما کی گرفتاری کا بے حد دکھ ہوا اور اس کے ردعمل کے طور پر آپ 1917ء میں ہوم رول لیگ میں شامل ہو گئے۔ پھر آپ کو اس لیگ کی بمبئی شاخ کا صدر چن لیا گیا۔ اس پارٹی کا مقصد بھی معاہدہ لکھنؤ کو کامیاب بنانا تھا۔

مسز اینی بیسنٹ

برطانوی خاتون 1893ء میں ہندوستان میں آئیں اور یہاں کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ بنارس میں ایک ہندو کالج کی بنیاد رکھی اور کانگریس کی سرگرم رکن بن گئیں۔

بمبئی جناح ہال 1918ء

ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ولنگڈن ہندوستان دشمن پالیسی کے لیے مشہور تھا۔ بمبئی کے چند خوشامدی اسے شاندار الوداعی پارٹی دینا چاہتے تھے۔ جسے قائد اعظم کی مخالفت کی وجہ سے روک دیا گیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عوامی لیڈر نے وائسرائے کے ساتھ ٹکر لی اور کامیاب ہوا۔ عوام بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مل کر بمبئی میں آپ کے نام پر ایک شاندار عمارت تعمیر کی جس کا نام جناح ہال رکھا۔ یہ یادگاری عمارت آج بھی بمبئی (بھارت) میں موجود ہے۔ اس کا افتتاح محترمہ سروجنی نائیڈو نے کیا تھا اور وہاں پرجوش تقریر کی تھی۔

محترمہ سروجنی نائیڈو

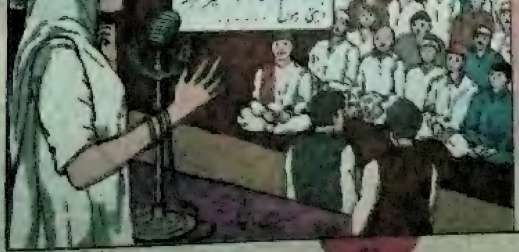

انگریزی زبان کی بہترین شاعرہ تھیں۔ ان کا شمار کانگریس کے نمایاں ارکان میں ہوتا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ انہیں بلبل ہند کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

مصنف: ڈاکٹر انجم رحمانی

مصور: محمود حسن زیدی

دوسری شادی

شادی سے دو سال پہلے قائد اعظم کا ہندوستان کے مشہور پارسی تاجر ڈنشا پیٹٹ سے قانونی اور سیاسی معاملات کے بارے میں رابطہ رہا وہیں سر ڈنشا کی بیٹی رتن بائی سے ملاقات ہوئی جو آپ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئیں۔ دونوں کو گھڑسواری کا بہت شوق تھا اپنے اس مشغلے کے واسطے بھی دونوں وقتاً فوقتاً تبادلہ خیال کرتے رہتے اس طرح انہیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع مل گیا اور پھر دو سال بعد 1918ء میں رتن بائی نے اسلام قبول کر لیا اور آپ سے ان کی شادی ہو گئی ان کا نکاح بمبئی کی ایک مسجد میں ہوا۔

ایک سال بعد بیٹی دینا جناح پیدا ہوئی

قائد اعظم اور رتن بائی کی شادی 1918ء کو ہوئی۔ 1929ء میں رتن بائی کا انتقال ہو گیا اور اس طرح یہ ساتھ ختم ہو گیا۔

دینا جناح

15 اگست 1919ء میں پیدا ہوئیں 1929ء کو جب ماں کا انتقال ہوا تو قائد اعظم نے ان کی پرورش کے لیے نانی کے سپرد کر دیا 12 سال کی عمر ہوئی تو انہیں برطانیہ تعلیم کے لیے بھیج دیا۔ قائد اعظم اکثر چھٹیاں ان کے ساتھ گزارتے۔ باپ بیٹی کا یہ رشتہ قائد اعظم کی وفات تک قائم رہا۔

باقی آئندہ

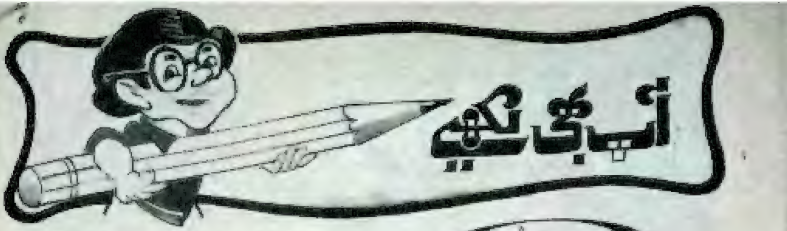

باسی روٹی

شاکرہ ناز، لاہور

"شوبی بیٹا اٹھ جاؤ اسکول جانے کا وقت ہو گیا ہے"۔ شوبی کی امی نے اسے پیار سے جگایا مگر شوبی کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔ "اٹھ جاؤ بیٹا دیر ہو جائے گی"۔

شوبی نے سوچا دیر ہو گئی تو سر کی ڈانٹ کھانی پڑے گی۔ مجبوراً اسے اٹھنا پڑا۔ جلدی جلدی تیار ہوا مگر اسکول لگنے میں اب صرف دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اس لیے ناشتا کیے بغیر ہی بستہ اٹھا کر چل پڑا۔

"شوبی ناشتا نہیں کرو گے" امی نے پکارا۔

"نہیں امی دیر ہو رہی ہے" یہ کہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دس منٹ میں اسکول پہنچا تو اسمبلی کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ وہ وقت پر اسکول پہنچ گیا ہے۔ کلاس شروع ہوئی۔ ماسٹر صاحب نے اسلامیات کی کتابیں نکالنے کو کہا۔ سبق پڑھانے کے بعد ماسٹر صاحب بولے "بچو! آج میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں"۔

تمام بچے توجہ سے ان کی بات سننے لگے تو ماسٹر صاحب بولے "بچو! دوسروں کی مدد کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ صاحب استطاعت لوگوں کو چاہیے کہ غریبوں کی خوب دل کھول کر مدد کریں۔ یہ بات میں آج آپ کو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کل میں نے چند بچوں کو کوڑے کے ڈھیر سے روٹی کے ٹکڑے اٹھا کر کھاتے دیکھا"۔

"سر انہیں گندگی پر سے ٹکڑے اٹھا کر کھاتے ہوئے گھن نہیں آ رہی تھی" شوبی نے ماسٹر صاحب کی بات کاٹتے ہوئے منہ بگاڑ کر کہا۔ ماسٹر صاحب نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولے "شعیب بیٹا! جب انسان مجبور ہو، کھانے کو اس کے پاس کچھ نہ ہو، بھوک چین نہ لینے دیتی ہو تو انسان کو گندگی اور صفائی کا احساس نہیں رہتا۔ فرض کرو ایسی صورت حال تمہارے ساتھ ہو، تم دو دن سے بھوکے ہو اور لوگ تمہاری مدد کرنے کے بجائے تمہیں دھتکار دیں تو تم کیا کرو گے" ماسٹر صاحب نے شوبی کی طرف دیکھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ ماسٹر صاحب بولے "بیٹا! پھر تم بھی کوڑے پر سے روٹی اٹھا کر کھانے پر مجبور ہو گے"۔

"اونہہ میں کیوں کوڑے پر سے روٹی اٹھا کر کھاؤں گا؟ مجھے تو باسی روٹی سے اتنی نفرت ہے" شوبی نے انتہائی غرور سے دل میں سوچا اور سر جھکا کر بیٹھا رہا۔

اسکول سے چھٹی ہوئی تو شوبی گھر کی طرف بھاگا۔ وہ گھر میں داخل ہوا۔ صبح ناشتا بھی نہیں کر کے گیا تھا۔ اس لیے اسے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ امی سے کھانا مانگا تو وہ اسے منہ ہاتھ دھونے کا کہ کر کچن سے کھانا لینے چلی گئیں۔ شوبی منہ ہاتھ دھو کر آیا تو امی کھانا دسترخوان پر لگا چکی تھیں۔ شوبی نے جلدی سے روٹیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو صبح کے پراٹھے دیکھ کر بولا "یہ کیا باسی روٹی؟"

"ہاں بیٹا! آج میں دوپہر کو روٹیاں نہیں پکا سکی۔ میرے سر میں درد تھا اس لیے صبح کے پراٹھے ہی گرم کر لائی ہوں" امی نے جواب دیا

شوبی غصے سے بولا "امی آپ کو پتا ہے میں باسی روٹی نہیں کھاتا" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا شوبی تم بیٹھو میں ابھی تازہ روٹی تیار کر دیتی ہوں"

نے محبت سے کہا لیکن وہ منہ پھلائے اپنے کمرے میں چلا گیا اور کھانا کھائے بغیر ہی لیٹ گیا۔

"آگ آگ" کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے کمرے میں دھواں بھر رہا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ شوبی چلانے لگا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے شوبی پر گیلا کمبل ڈالا اور شعلوں میں سے باہر نکال لایا۔ شوبی کی امی شوبی کو زندہ سلامت دیکھ کر اس کی طرف بڑھیں۔ شوبی روتا ہوا امی سے لپٹ گیا۔ وہ سخت خوف زدہ تھا۔ دونوں ماں بیٹا بے بسی آنکھوں سے اپنے گھر کو جلتے دیکھ رہے تھے۔ شوبی کے ابو کو جب اس حادثے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً پہنچے لیکن اب تک تمام گھر جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ ہر طرف راکھ کا ڈھیر دیکھ کر اس کے ابو کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔ کچھ عرصہ لوگوں نے ان کی مدد کی لیکن کب تک۔ آخر کار سب دوست رشتہ دار ساتھ چھوڑ گئے۔ شوبی کی امی ان صدمات کی وجہ سے بیمار رہنے لگیں۔ کھانے کے لیے پیسے نہ تھے دوائی کہاں سے خریدتے۔ شوبی نے چند لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلایا لیکن انہوں نے اسے دھتکار دیا۔ شوبی کو سخت بھوک لگی تھی۔ آخر وہ ایک کوڑے کے ڈھیر کے پاس پہنچا۔ وہاں اسے روٹی کے چند ٹکڑے نظر آئے۔

اس نے جھپٹ کر وہ اٹھائے اور منہ میں رکھنے ہی لگا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ سب ایک خواب تھا۔ خدا نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ وہ سیدھا کچن میں پہنچا۔ امی شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر بولیں "شوبی بیٹا! میں نے تازہ روٹی پکا دی ہے اب کھانا کھا لو۔ بیٹا تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا"۔

"نہیں امی! میں تو وہی صبح والے پراٹھے کھاؤں گا"۔ اور شوبی وہی صبح والے پراٹھے نکال کر کھانے لگا۔ امی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شوبی مزے سے کھانا کھا رہا تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

صبیحہ کا دسترخوان

ارم عبیر قیب، اسلام آباد

کتابوں کا گرینڈ سیل میلہ جاری تھا۔ "کتابوں پر 25 سے 75% فی صد تک رعایت" کا بینر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی بعض کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر شیلف میں رکھی ایک کتاب پر پڑی جس کے ٹائٹل پر بڑے جگمگاتے حروف سے لکھا تھا۔ "صبیحہ کا دسترخوان"

میں نے شیلف میں سے وہ کتاب نکال لی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ "اوہ! کھانوں کی مزے دار ترکیبیں"

مصنف نے لکھا تھا کہ آپ محض اس کتاب کو پڑھ کر ایسے مزے دار کھانے پکا سکتے ہیں کہ آپ سمیت سب انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

مجھے کچن سے تو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا مگر تر تر سے کھانے کھانے کا میں بڑا شوقین تھا۔ جب تک آپی کی شادی نہیں ہوئی تھی میرا یہ شوق پورا ہوتا رہا کیوں کہ آپی نے پاکستانی اور چائنیز کھانے پکانے کے بہت سے کورس کر رکھے تھے۔ ان کی شادی کے بعد گھر کے باقی تمام کام خصوصاً کچن اور دادی اماں کی تیمارداری کی ذمہ داری امی جان پر آپڑی تو انہیں اتنی فرصت ہی نہیں مل پاتی تھی کہ میری زبان کے چسکے پورے کرتیں۔ چنانچہ میں یہی سوچ کر یہ کتاب خرید لایا تھا کہ ترکیبیں پڑھ کر خود ہی مزے دار کھانے پکا لیا کروں گا۔

اگلے روز امی جان دادی جان کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئیں تو میں بیرونی دروازہ بند کر کے کتاب اٹھائے کچن میں چلا آیا۔ کتاب کھولی۔ سب سے پہلی ترکیب تھی۔ "مصالے دار چکن روسٹ"

"واہ" میرے منہ میں نام پڑھ کر ہی بے اختیار پانی بھر

آیا۔ بس آج تو یہی ڈش بنا لیتا ہوں۔ ارادہ پکا کر کے پوری توجہ سے ترکیب میں غرق ہو گیا۔ لکھا تھا۔ "مسالے دار روسٹ بنانے کے لئے ایک عدد مرغ لیں"

"ایں مرغ! ہمارے ڈیپ فریزر میں تو مرغیاں ہی مرغیاں بھری پڑی ہیں، صبیحہ آنٹی" میں نے تصور میں کتاب کی مصنفہ کو مخاطب کر کے انہیں اپنی مشکل بتائی۔ پھر مرغ کی دستیابی کے لئے ادھر ادھر سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا۔

"ارے ہاں مسئلہ حل ہو گیا" میں نے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر خوشی سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا۔

"سامنے والے خان صاحب کا مرغ پکڑ لاتا ہوں"۔ بس یہ سوچ کر میں اٹھا۔ بغل میں چادر دبائی اور مرغ کی تلاش میں نکل پڑا۔ خان صاحب کے مرغ، جسے وہ پیار سے شیر کہتے ہیں، کی تلاش میں مجھے زیادہ خواری نہیں اٹھانی پڑی۔ کرنل آنٹی کے گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگی باڑ میں "شیر" دو تین "شیرنیوں" میرا مطلب ہے مرغیوں کے ہم راہ زمین کرید رہا تھا۔ گرم دوپہر میں ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے گلی کا بغور جائزہ لیا۔ "شیر" اغوا کرنے کے لئے حالات نہایت سازگار تھے۔ میں نے پیچھے سے جا کر اس کے اوپر چادر پھینکی۔

فوری طور پر تو وہ سمجھ ہی نہ پایا کہ یہ سیدھا سادہ اغوا کا کیس ہے۔ میں اس کو چادر میں لپیٹ کر گھر لے آیا۔ غسل خانے میں لے جا کر بالٹی اس کے اوپر اوندھی رکھی اور خود آکر ترکیب پڑھنے لگا، لکھا تھا "مرغ کو دھو کر اچھی طرح صاف کر لیں"۔

میں نے کتاب میز پر رکھی اور غسل خانے میں آکر "شیر" کو نہلانے لگا۔ نہلانے دھلانے کے دوران میں اس نے کتنی ہی بار فرار ہونے کی کوشش کی مگر میں نے غسل خانے کا دروازہ بند کر کے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ اور اس کو صرف نہلایا ہی نہیں بلکہ شیمپو بھی کرایا۔ یہ مرحلہ طے ہو چکا تو میں نے "شیر" کو، جو بھیگ کر اس وقت چوہا زیادہ دکھائی دے رہا تھا، اٹھایا اور اپنے ساتھ ہی کچن میں لے آیا۔ بے چارہ بھیگی بلی کی طرح دبک کر بیٹھ گیا۔

میں نے "شیر" کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد دوبارہ کتاب اٹھائی اور آگے پڑھنے لگا "ایک پیالی پھینٹے ہوئے دہی میں حسب ضرورت نمک، ایک کھانے کا چمچ پسا ہوا زیرہ، ایک کھانے کا چمچ سرخ مرچ، ایک چائے کا چمچ پسا ہوا دھنیہ ملائیں اور اچھی طرح مکس کر کے مرغ کے اوپر مل دیں"۔

میں اٹھا اور جا کر فریج میں سے دہی نکال لایا۔ پھر سارے مسالے ناپ کر دہی میں ملائے۔ مکس کئے اور پیالی اٹھائے "شیر" کے پاس آ گیا۔ زمین پر بیٹھ کر میں نے شیر کو گردن سے پکڑا اور ہاتھ سے ہی اس کو مسالا لگانے لگا۔ دونوں طرف مسالا لگانے کے بعد گردن کی باری آئی۔ ابھی میں نے ذرا سی گرفت ڈھیلی کی ہی تھی کہ شیر نے دونوں پر زور سے پھڑپھڑائے۔ لال مرچوں والا دہی اڑ کر میری کھلی آنکھوں میں جا گھسا۔

میں نے "ہائے" کہ کر ایک آنکھ پر ہاتھ رکھا اور سنک کی طرف دوڑا پھر لگا زور زور سے چھپاکے مارنے۔

"شیر" نے موقع غنیمت جانا۔ ایک ہائی جمپ لگا کر دیوار پر جا چڑھا اور لگا زور زور سے بانگیں دینے۔

"ککڑوں کوں، ککڑوں کوں" شیر نے آواز نکالی اور باہر گلی میں کود گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کہ رہا ہو "میں اغوا ہو گیا تھا" میں نے چھپاکوں کا سلسلہ بند کیا۔ ایک ہاتھ آنکھ پر رکھا اور "شیر" کے پیچھے بھاگا مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ "شیر" جا کر خان صاحب کی گود میں چڑھ چکا تھا اور زور زور سے اپنے اغوا ہونے کا قصہ بیان کر رہا تھا۔ ادھر خان صاحب نے چوں کہ اپنی سرمہ لگی آنکھوں سے بذات خود "شیر" کو میرے گھر سے بھاگ کر نکلتے ہوئے دیکھا تھا اس لئے جیسے ہی میں ان کی رینج میں آیا انہوں نے شیر کو زمین پر چھوڑا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ کر لگے جھٹکے دینے۔

"اوئی خانہ خراب کا بچہ! امارا "شیر" کو پکڑتی ہے؟ تم کو شرم نہیں آتا ہے؟"

خان صاحب نے ایک ہی فقرے میں مجھے لڑکے سے لڑکی بنا دیا جس پر میں بلبلا اٹھا اور غصے سے بولا "خان صاحب

میرا گریبان چھوڑیں اور میری بات سنیں"
خان صاحب نے گریبان چھوڑ کر میری بات تو خاک سننا تھی الٹا ایک ہاتھ سے مجھے طمانچہ رسید کر دیا۔ اپنی نئی شرٹ کا یہ حال دیکھ کر میں روہانسا ہو گیا۔

"ام تمہارا قیمہ کرے گا" اسی گلی میں، تمہارا گھر کے سامنے"۔

اس سے قبل کہ خان صاحب واقعی میرا قیمہ بنا دیتے عین وقت پر والد محترم دفتر سے تشریف لے آئے۔

"کیا ہوا خان صاحب کیا معاملہ ہے؟" والد صاحب نے چنگاریاں اڑاتے خان صاحب سے دریافت کیا۔

"حاجی صاحب، آپ بیچ میں مت آؤ۔ ام تمہارا بڑا عزت کرتا ہے پر اس کو ام نہیں چھوڑے گا"۔ خان صاحب نے میرے گریبان پر گرفت اور سخت کر دی۔ اس پر میں چیخ پڑا

"خان صاحب میری بات تو سنو"۔

خان صاحب تھوڑے سے ٹھنڈے ہوئے اور بولے۔

"تم امارے "شیر" کے ساتھ کیا کرنے لگا تھا؟"۔

"لیجئے خان صاحب آپ خود ہی دیکھ لیجئے"۔ میں بھاگ کر گھر گیا اور کتاب "صبیحہ کا دسترخوان" اٹھا لایا۔ اپنی سمجھ کے مطابق انھیں مسالے دار چکن روسٹ کی ترکیب سمجھائی۔ خان صاحب اور والد محترم ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ خان صاحب نے مجھے سینے سے لگایا۔ پھر مجھے ساتھ لے کر "سویٹ پوائنٹ" کے چرغہ ہاؤس چلے آئے۔ یہاں مجھے روسٹ بنا دکھایا بھی اور کھلایا بھی۔ ادائیگی بھی خود کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آخری بات مجھے سب سے زیادہ پسند آئی (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

قتل کا راز

محمد لطیف، فیصل آباد

چھٹی کی گھنٹی بجی۔ اسد اور حمزہ اپنے بستے سنبھالے باہر آ گئے۔ وہ دونوں گہرے دوست تھے۔ اپنے دھیان میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ اچانک وہ ایک سفید بنگلے کے پاس ٹھٹک کر رک گئے۔ "حمزہ، تم نے فائرنگ کی آواز سنی" اسد نے کہا۔

"ہاں، مجھے تو معاملہ گڑبڑ لگتا ہے" حمزہ نے کہا۔

"ٹھہرو میں اس درخت پر چڑھ کر اندر دیکھتا ہوں" اسد نے کہا۔

جس درخت کے پیچھے وہ چھپے تھے وہ بنگلے کی دیوار کے بالکل ساتھ اگا ہوا تھا۔ اسد نے درخت پر چڑھ کر اندر جھانکا۔ بنگلے کے برآمدے میں ایک موٹا شخص اپنے ہاتھ میں خوف ناک قسم کی گن لئے کھڑا تھا۔ اس شخص کے سامنے، برآمدے میں خون بکھرا ہوا تھا۔ اور اس کے کپڑوں پر بھی خون لگا ہوا تھا۔

اسد نے نیچے اتر کر پوری تفصیل حمزہ کو بتائی

"یقیناً کسی آدمی کو قتل کیا ہو گا اس موٹے پٹھان نے" حمزہ نے قیاس آرائی کی۔

"اب کیا کریں" اسد نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں پہلے ہمیں اندر کا جائزہ لینا چاہیے" حمزہ نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے" اسد نے تائید کی۔

"وہ موٹا شاید اندر چلا گیا ہے" اسد نے کہا۔

وہ دونوں درخت کے ذریعے دبے پاؤں بنگلے کے صحن میں اتر گئے اور اب دونوں آہستہ آہستہ برآمدے کی طرف بڑھنے لگے جہاں ابھی بھی خون بکھرا ہوا تھا۔

اچانک وہ شخص باہر نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کپڑا تھا اور دوسرے میں گن۔ اندر سے کپڑا شاید وہ خون صاف کرنے کے لئے لایا تھا۔ وہ دونوں اس شخص کی طرف دیکھ کر پیچھے کی طرف کھسکنے لگے۔ حمزہ کا پاؤں گملے سے ٹکرایا اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ شکر ہے کہ وہ دونوں لان میں لگی باڑ کی اوٹ میں تھے۔

"اری کون کم بخت ہے" وہ شخص اونچی آواز میں بولا۔ وہ دونوں اس کی آواز سن کر گھبرا گئے۔ وہ تیزی سے

اس دیوار کے پاس آئے جہاں سے انھوں نے اندر چھلانگیں لگائی تھیں۔ پھر اسد نے تیزی سے دیوار پر چڑھ کر باہر چھلانگ لگا دی۔ حمزہ نے بھی ایسا ہی کیا۔

"اب کیا کریں؟" حمزہ نے کہا۔

"تم نہ کرتے اور نہ اسے پتا چلتا کہ یہاں کوئی ہے" اسد نے غصیلی آواز میں کہا۔

"اسد میرے ماموں جس تھانے میں ہیں وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں" حمزہ نے اسد کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پر سوچ انداز میں کہا۔

"چلو پھر" اسد نے کہا۔

وہ دونوں تقریباً 15 منٹ میں تھانے پہنچ گئے۔ حمزہ کے ماموں تھانے میں سب انسپکٹر تھے۔ وہ حمزہ کو دیکھ کر چونک گئے۔ حمزہ نے ساری تفصیل بتائی۔ انھوں نے ان کی ساری بات غور سے سنی۔ پھر ان دونوں کے گھر فون کر کے کہا کہ آپ لوگ پریشان نہ ہوں دونوں بچے میرے پاس ہیں۔ کیوں کہ انھیں اسکول سے چھٹی ہوئے تقریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔

پھر حمزہ کے ماموں نے چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور حمزہ اور اسد کے ساتھ چل پڑے۔ انھوں نے سفید بنگلے کی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد وہی موٹا شخص باہر نکلا۔

"ہمیں تلاشی لینی ہے" حمزہ کے ماموں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا تلاشی" وہ شخص حیرانی سے بولا۔

"کس بات کے بچے ادھر ہٹو"۔ چار سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور باقی سب اندر داخل ہو گئے۔ وہ برآمدے سے خون صاف کر چکا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ کس کو قتل کیا ہے؟"

"قتل؟" اس شخص نے گھبرا کر کہا۔

"انکل اس نے برآمدے سے خون بھی صاف کر دیا ہے" اسد نے جلدی سے کہا۔

"خون؟" وہ موٹا شخص منہ میں بڑبڑایا۔ پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"ارے صاحب، ہم آپ کو پورا بات بتاتا ہے۔ اس کوٹھی کا مالک باہر ہوتی ہے۔ میں ان کا باڈی گارڈ ہے۔ آج جب میں ادھر اندر آیا تو ایک کتا کم بخت کچن میں گھس کر دودھ پیتا۔ میں نے اسے باہر پھینکا۔ وہ پھر اندر آگیا۔ میں نے گولی مار دیا۔ لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟" موٹا پٹھان پوری بات بتا کر چونک کر بولا۔

"دراصل خان صاحب، فائرنگ کی آواز سن کر ان بچوں نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تھی"۔ ماموں نے اسد اور حمزہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب سمجھا اس باڑ کے پیچھے یہ بچہ لوگ ہی تھا"۔

"خان صاحب، ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں" ماموں نے کہا۔ "آپ کو ہماری وجہ سے پریشانی ہوئی"۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے"؟ پٹھان مسکرا کر بولا۔ اور پھر وہ دونوں پولیس کی نفری کے ساتھ خان صاحب کے گھر سے واپس لوٹے (تیسرا انعام 80 روپے کی کتابیں)۔

زندگی کا امتحان

محمد عثمان، جلالیہ اٹک

میں اور عمیر گھر میں بیٹھے امتحان کی تیاری کر رہے تھے کیوں کہ ٹھیک ایک ہفتے بعد ہمارا امتحان شروع ہونے والا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اور جماعت کے ذہین لڑکوں میں ہمارا شمار ہوتا تھا۔ کبھی عمیر پہلے نمبر پر آتا تو کبھی میں۔

ابھی ہماری تیاری جاری تھی کہ مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ اذان سن کر عمیر اٹھ کھڑا ہوا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں ابھی نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ آؤ تم بھی" عمیر نے جواب دیا۔

"نہیں تم جاؤ مجھے ابھی مزید تیاری کرنی ہے"۔

ابھی میری بات ختم نہ ہوئی تھی کہ امی جان کمرے میں

بل ہو گئیں۔ انھوں نے شاید میری بات سن لی تھی "جاؤ نا بیٹا تم بھی نماز پڑھ آؤ"۔

"امی میں امتحان کی تیاری کر رہا ہوں"۔

"دیکھو بیٹا' تم اس امتحان کی تیاری کر رہے ہو جو تیرے اسکول میں ہو رہا ہے۔ یقیناً تم کام یاب ہو گے اور تمہیں خوشی بھی ہو گی۔ لیکن بیٹا ایک امتحان ایسا بھی ہے جسے زندگی کا امتحان کہتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ مرنے کے بعد نکلے گا"۔

"وہ کون سا امتحان' امی"؟ میں نے پوچھا۔

"بیٹا' وہ زندگی کا امتحان ہے جو اللہ میاں لے رہا ہے۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور ہم سب ہر لمحہ زندگی کے امتحان کا پرچہ حل کرنے میں مصروف ہیں۔ نماز اس پرچے کا پہلا سوال ہے"۔ امی نے تفصیل سے بتا دیا "قیامت کے دن پہلا سوال نماز کے بارے میں ہی ہو گا۔ تمھیں چاہیے کہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہر وقت تیار رہو' یعنی اپنی کوئی نماز قضا نہ ہونے دو"۔

یہ سن کر میں اٹھا اور عمیر کے ساتھ نماز کا سوال حل کرنے چلا گیا تاکہ اسکول کے امتحان کی طرح زندگی کے امتحان میں بھی پاس ہو سکوں۔ (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

غلط فہمی

یاسر مجید' رحیم یار خان

یہ واقعہ آج سے چند سال پہلے کا ہے۔ ایک دن ہم اور ہماری خالہ جان بازار سے واپس آ رہے تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر دو لڑکیاں جا رہی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ چلتے چلتے ایک لڑکی نے دوسری کو مخاطب کر کے کہا۔ "حمیرا ذرا تیز تیز چلو ڈرامہ شروع ہونے والا ہے"۔

"ارے ہاں سنا ہے بڑا اچھا ڈرامہ نشر ہو رہا ہے"۔ دوسری بولی۔

ان دونوں کی باتیں سن کر خالہ جان بے چین ہو گئیں اور جب ان سے رہا نہ گیا تو لڑکیوں سے پوچھا "اے بیٹا' کون سا ڈرامہ آئے گا"۔

"خاموش" ایک لڑکی زور سے بولی

اتنا سننا تھا کہ ہماری خالہ جان کو غصہ آگیا اور بولیں۔ "بدتمیز' بے شرم تجھے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے؟ ڈرامے کا نام کیا پوچھ لیا کہتی ہے' خاموش"

لڑکیاں گھبرا گئیں۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں مگر خالہ انھیں موقع نہیں دے رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ لوگ جمع ہوتے ان لڑکیوں نے ایک جانب دوڑ لگا دی۔ خیر بڑی مشکل سے خالہ جان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ گھر پہنچے۔ خالہ جان کو چائے دی۔ ٹی وی لاؤنج میں ہمارا چھوٹا بھائی' اسلم' ہوم ورک کر رہا تھا۔

"اے بیٹا' ذرا ٹی وی آن کرنا میرا موڈ ٹھیک ہو"۔ خالہ جان نے اسلم سے کہا۔

"آج کون سا ڈرامہ آئے گا؟"۔ ہم نے اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔ "خاموش" اسلم نے ہمیں گھور کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس کی پیٹھ پر زور سے خالہ جان کی جوتی لگی۔ "ارے کم بخت' نالائق! بڑی بہن سے بات کرنے کی تمیز نہیں"۔ خالہ جان ایک بار پھر برس پڑیں۔

ادھر اسلم صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے اور ادھر ہم حیران و پریشان بیٹھے تھے۔ امی دوسرے کمرے سے دوڑ کر آئیں۔ انھیں جب ساری بات معلوم ہوئی تو اسلم کو سمجھاتیں اور چپ کراتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ بڑی مشکل سے خالہ جان کا غصہ ٹھنڈا کیا اور دھیان ٹی وی کی طرف لگا دیا' جہاں ایک اشتہار چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسکرین پر اناؤنسر نمودار ہوئی جو کہہ رہی تھیں۔ "آیئے ناظرین نئی ڈرامہ سیریل "خاموش" کی پہلی قسط دیکھتے ہیں"۔

ہم نے چونک کر خالہ جان کی طرف دیکھا اور انھوں نے ہمیں دیکھا۔ دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ اس سے پہلے کہ منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹتا ہم بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ (پانچواں انعام 60 روپے کی کتابیں)۔

ملا نصر الدین نے کھیر پکائی

شاہد ریاض شاہد

کارٹون کہانی

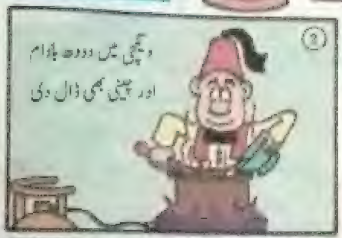

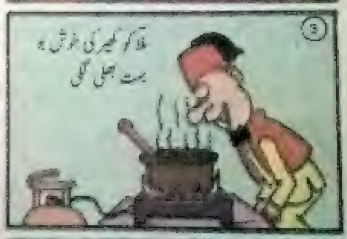

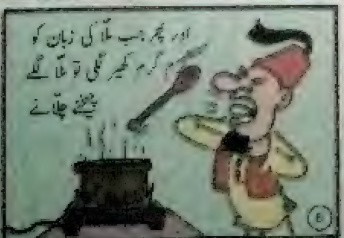

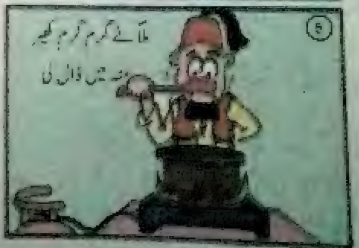

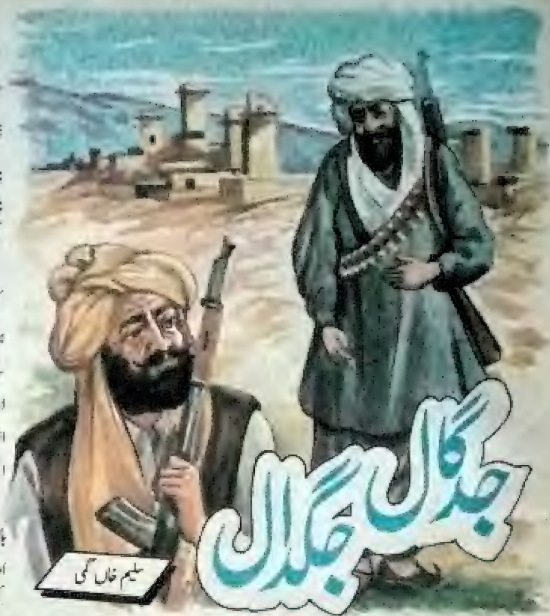

جنگل جنگل

سلیم خان گمی

بچے کچھے دونوں لشکر لڑنے مرنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

چاکر خان بڑا تھا اور اس کی عمر 65 سال تھی۔ وہ رند قبیلے کا سردار تھا۔ گواہرام خان عمر میں چھوٹا تھا اور اس کی عمر 60 برس تھی۔ وہ لاشاری قبیلے کا سردار تھا۔ دونوں چچیرے بھائی تھے لیکن اب ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔ دونوں کے قبیلے بھی پچھلے تیس سال سے لڑ رہے تھے۔ فارسی اور بلوچی میں وہ سی سالہ جنگ کہتے ہیں۔ سی کا مطلب ہے تیس۔ بلوچوں کی یہ تیس سالہ جنگ پہلے سارے بلوچستان میں لڑی گئی۔ اب اس کا دائرہ محدود ہو گیا تھا۔ اب یہ سبی کے علاقے میں لڑی جا رہی تھی۔ سبی کا قلعہ میر چاکر خان رند کے قبضہ میں تھا اور میر گواہرام خان لاشاری کے جنگجو قلعہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔ چاکر خان اور اس کے جنگجو بھی اب قلعہ چھوڑ کر کھلے میدان میں آ گئے تھے اور جنگ کا آخری معرکہ لڑا جانے والا تھا۔

بوڑھا نودبندغ جس کی عمر 80 سال تھی اور جو گواہرام خان لاشاری کا باپ تھا' ایک بڑے پتھر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا بیٹا گواہرام خان چتکبرے گھوڑے پر سوار تھا۔

نودبندغ نے سوچ کر کہا "تیس سال ہو گئے لڑتے ہوئے لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کبھی وہ جیت جاتے ہیں اور کبھی ہم۔ پوری جیت نہ ان کی ہوئی اور نہ ہماری۔ ایسی لڑائی کا کیا فائدہ بیٹا؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بابا جان کہ کبھی چاکر خاں ہارا اور کبھی ہم لیکن مکمل مات کسی کو نہ ہوئی۔ لیکن یہ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم مکمل طور پر چاکر خاں کو ہرا سکیں" گواہرام نے کہا

"چاکر خاں کو مکمل طور پر کبھی کسی نے نہیں ہرایا۔ وہ بلوچوں کی دنیا کا شیر ہے۔ خواہ یہ بلوچ کہیں بھی ہوں۔ میرا مطلب ہے بحیرہ عرب کے کنارے ہوں یا افغانستان کے پہاڑوں میں' ایران کے سبزہ زاروں میں ہوں یا حلب کی وادی کے شاداب کھیتوں میں" نودبندغ بولا

"ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ لاشاریوں نے بھی کبھی شکست نہیں مانی" گواہرام نے چاکر خاں کی تعریف سے چڑ کر کہا۔

"ہم چاکر خاں سے کئی بار شکست کھا چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شکست کو تسلیم نہیں کیا۔ دیکھتے نہیں وہ شیر دل بہادر اب نہیں نظر نہیں آتے جو کبھی تیری مجلس کی شان ہوا کرتے تھے۔ ان کو رندوں کی تلواریں ہڑپ کر گئیں" نودبندغ نے کہا

"بابا! لڑائی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو بہادر تلوار سجا کر لڑائی کے میدان میں آتا ہے ضروری نہیں وہ سرخرو ہو۔ دشمن کی تلوار سرخرو ہو سکتی ہے۔ چاکر خاں خود کو چاند سمجھتا تھا اور اپنے بہادر ساتھیوں کو ستارے' اب ان ستاروں کا جھرمٹ کہاں گیا بابا؟"

"چاکر خاں کے جنگ جو ستارے بھی مٹی چاٹ گئے۔ وہ ہماری تلواروں کی نذر ہو گئے۔ اب چاکر خاں کے پاس نام ور بہادر لی برگ ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا"۔

"اسی لیے میں کہتا ہوں کہ آج کا معرکہ تیس سال پہلے جو جنگ شروع ہوئی تھی..." نود بندغ کچھ کہنے لگا تھا کہ گواہرام خان بیچ میں بول پڑا۔

"جنگ شروع نہیں ہوئی تھی جنگ شروع کی گئی تھی۔ جنگیں شروع کی جاتی ہیں آپ سے آپ شروع نہیں ہو جاتیں"۔

بابا نود بندغ نے سر جھٹک کر کہا "چلو یونہی سہی۔ آج سے تیس سال پہلے جو جنگ شروع کی گئی تھی آج اس کا آخری معرکہ ہے"۔

"آخری معرکہ؟" گواہرام خاں نے گھوڑے کی گردن کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا

"یہ آخری معرکہ تو ہے لیکن یہ کہاں لکھا ہے کہ اس میں تم جیت جاؤ گے؟ تم اور تمہارے ساتھی مارے بھی جا سکتے ہیں" نود بندغ بولا

"آپ دعا کریں میں کام یاب رہوں" گواہرام خاں نے باپ سے کہا

"میں تو چاہتا ہوں یہ جنگ ختم ہو۔ اس جنگ نے بلوچوں کے ہزاروں لال خاک میں ملا دیے ہیں۔ ہر طرف امن اور چین کی خوش بو بکھر جائے۔ پرندوں کی چہکار کانوں میں رس گھولے۔ ہمارے گھروں اور خیموں سے بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آئیں۔ ماؤں کے لبوں سے لوریوں کے بول ابھریں۔ خوف دور ہو۔ نہ کوئی ڈرے اور نہ کوئی ڈرائے۔ لوگ کھیتوں کھلیانوں' پہاڑوں اور ندی نالوں میں کام کریں۔ کھیتوں میں اناج اگائیں' کھلیانوں میں اٹھا کریں۔ پہاڑوں پر بھیڑ بکریاں پالیں اور ندی نالوں میں مچھلیوں کا شکار کریں اور سونے کی ڈلیاں تلاش کریں۔ اس کے الٹ میں تیس سال سے تلواروں کی جھنکار سن سن کر بدمزہ ہو گیا ہوں" نود بندغ بولا

"تو پھر جاؤ اور چاکر خاں سے صلح کر لو۔ لے جاؤ میرا گھوڑا"

گواہرام خان نے گھوڑے سے اتر کر لگام اپنے باپ کے ہاتھ میں تھمادی اور پھر اسے سوار ہونے میں مدد دی۔

نود بندغ کے آنے سے پہلے چاکر خاں جو رند قبیلے کا سردار تھا سیب کے درخت کے نیچے زمین پر بیٹھا تھا اور اس کے پاس اس کا بہادر جرنیل لی برگ ہتھیاروں سے لیس کھڑا تھا۔ رند جوان اپنے اپنے گھوڑے لیے درختوں کی اوٹ میں لڑنے مرنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ایک خادم نے قہوہ تیار کیا اور چاکر خاں رند کو پیش کیا اس کے بعد خادم نے دوسرا پیالہ لی برگ کو دیا۔ قہوے کا گھونٹ پی کر لی برگ بولا "سردار اعظم قہوہ مزے دار ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"ہاں' تم درست کہتے ہو یہ خادم قہوہ بنانے کا ماہر ہے" چاکر خاں بولا

"پہلا خادم قہوہ اتنا اچھا نہیں بناتا تھا لیکن وہ لڑتا خوب تھا" لی برگ بولا

"خادم بھی لڑیں تو بہتر ہے۔ ابھی ہمارے بازو ہمارے جسم کے ساتھ ہیں اور تلوار اور ڈھال پکڑ سکتے ہیں" قہوے کی چسکی بھرتے ہوئے چاکر خاں بولا

"سردار اعظم ہم تیس سال سے لڑ رہے ہیں۔ ظاہر ہے اتنی لمبی لڑائی ہو تو خادموں اور آقاؤں کو مل کر لڑنا پڑتا ہے" پیالہ خادم کو واپس لوٹاتے ہوئے لی برگ بولا

"حضور! ایک گھوڑا آرہا ہے" خادم نے آنکھوں پر ہتھیلی سے سایہ کرتے ہوئے کہا۔

"خالی گھوڑا ہے یا اس پر کوئی سوار بھی ہے" چاکر خاں نے اطمینان سے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

"گھوڑے پر ایک سوار بھی ہے میرے آقا" خادم نے کہا۔

"ہماری طرف آرہا ہے سیدھا" لی برگ بولا۔

"گھوڑا سردار گواہرام لاشاری کا ہے" خادم نے بتایا۔

"اور اس پر سوار بابا نود بندغ ہے" لی برگ بولا۔

سردار چاکر خاں رند اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نود بندغ کے سر پر سفید پگڑی تھی جو اس بات کی نشانی تھی کہ وہ دوست کی حیثیت

سے قبائلی دشمن کی حیثیت سے۔ سفید رنگ قبائلی معاشرہ میں امن کا رنگ مانا جاتا ہے۔

"بابا نودبندغ بوڑھا ہو گیا ہے لیکن گھڑ سواری میں ذرا فرق نہیں آیا" چاکر خاں نے خوش ہو کر کہا

جب نودبندغ چاکر خاں کے قریب پہنچا تو چاکر خاں نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور پھر نودبندغ کا دایاں پاؤں پکڑ کر اپنے بائیں گھٹنے پر رکھا تاکہ وہ آرام سے اتر سکے۔ خادم نے آگے بڑھ کر چاکر خاں کے ہاتھ سے لگام پکڑی اور گھوڑے کو پکڑ کر سیب کے درخت سے باندھ دیا۔ اسی اثنا میں چاکر خاں نودبندغ کو سہارا دے کر ایرانی نشست پر لے گیا۔ نشست پر بیٹھنے سے پہلے نودبندغ نے قالین پر ہاتھ پھیرا اور بولا "ایرانی قالین ہے۔ بلوچستان میں ایسے قالین نہیں بنتے۔ یہ ذرا نرم و نازک ہے۔ ہمارے قالین اتنے نرم نہیں ہوتے اور مضبوط بھی زیادہ ہوتے ہیں"۔

"آپ نے درست فرمایا چچا جان ہمارے قالین بہت زیادہ خوب صورت نہیں ہوتے لیکن بہت مضبوط ضرور ہوتے ہیں" چاکر خاں بولا

"ہم بلوچوں کو طاقت کی ضرورت ہے خوب صورتی کی نہیں" نودبندغ بولا

"طاقت کی کیوں ضرورت ہے ہمیں زیادہ؟ یہ سوال میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ آپ عقل میں ہم سب سے آگے ہیں" چاکر خاں نے ہنس کر کہا

"آپ مجھے عقل مند کہتے ہیں، میں اپنے آپ کو بے وقوف سمجھتا ہوں" نودبندغ بولا۔

"وہ بھلا کیسے؟"

"جناب، عقل مند تو وہ ہوا جس کی بات مانی جائے۔ میری بات تو نہ آپ مانتے ہیں اور نہ گوہرام خاں مانتا ہے" نودبندغ بولا

خادم قہوہ تیار کر کے دو پیالے لایا اور اس نے ایک پیالہ بابا کے سامنے رکھ دیا اور دوسرا سردار چاکر خاں کے سامنے "بسم اللہ نوش جان کیجئے" چاکر خاں بولا۔

نودبندغ نے پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا "میں تم دونوں سے کہتا ہوں کہ لڑائی بند کرو۔ آپس میں صلح کرلو۔ آپس کی غارت گری ختم کرو۔ ظاہر ہے یہ عقل کی باتیں ہیں مگر تم دونوں اس پر عمل نہیں کرتے" نودبندغ نے یہ کہہ کر پیالے سے قہوے کا گھونٹ بھرا۔

"جو لڑائی تیس سال تک لڑی گئی ہو اور ختم نہ ہوئی ہو وہ بھلا اب کیسے ختم ہوگی اور وہ بھی صلح صفائی پر۔ یہ لڑائی تو اب چاکر خاں یا گوہرام خاں کے خاتمہ پر ہی ختم ہوگی"۔

"یوں نہیں کہنا چاہیے۔ جو کام 30 سال پہلے شروع ہوا تھا وہ آج ختم ہو جائے تو کیا برائی ہے" نودبندغ نے کہا

"میں لڑائی ختم کرنے کو تیار ہوں" چاکر خاں بولا

"گواہرام بھی لڑائی ختم کرنے کے لیے تیار ہے" نودبندغ نے بتایا

"اس کی طرف سے کوئی شرط ہو تو بتائیے"

"گواہرام کی طرف سے کوئی شرط نہیں ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی سرداری تسلیم کی جائے" نودبندغ بولا

"یہ ایک بڑی شرط ہے۔ میں بلوچستان کا سب سے بڑا سردار ہوں۔ میرا ہر حکم ان لوگوں کو ماننا ہوگا جو بلوچستان میں رہتے ہیں یا پھر وہ بلوچستان چھوڑ جائیں"۔

"چاکر خان 'میرے عزیز' میں آپ کی یہ بات مانتا ہوں" نودبندغ نے قہوے کا پیالہ خادم کو واپس کرتے ہوئے کہا

نودبندغ اٹھ کھڑا ہوا۔ خادم گھوڑا کھول کر لے آیا۔ چاکر خاں نے پہلے کی طرح اپنا گھٹنا پیش کیا۔ نودبندغ نے اس پر پیر رکھا اور زور لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

"اگر میں دوبارہ آیا تو سمجھ لیجئے گواہرام نے آپ کی بات مان لی" نودبندغ بولا

"خدا حافظ چچا" اسے چاکر خاں نے ہاتھ ہلا کر الوداع کیا اور دوبارہ فرشی نشست پر آکر بیٹھ گیا

چاکر خاں اور نودبندغ کی گفتگو کے دوران میں بی برگ نے کوئی دخل نہ دیا تھا۔ اب وہ گھوڑے سے اترا گھوڑے کو سیب کی شاخ سے باندھا اور اپنے سردار کے پہلو میں بیٹھ کر بولا "دونوں قبیلوں کے شہ زور جوان مارے جا چکے ہیں اب صلح صفائی کا کیا فائدہ ہے سردار؟"

"پہلے صلح ہو جاتی تو زیادہ فائدہ تھا لیکن لڑائی کے دوران میں کسی بھی وقت صلح ہو جائے تو فائدہ ہی ہوتا ہے' نقصان نہیں" چاکر خاں نے کہا

"آپ کا گواہرام خان سے مطالبہ ہے کہ چاکروں کی حکومت تسلیم کی جائے" بی برگ نے پوچھا

"ہاں 'بلوچستان میں سب سے بڑا قبیلہ اس وقت چاکروں کا ہے۔ ان کا سکہ چلتا ہے" چاکر خاں بولا

"پچھلے 30 سال سے تو بلوچستان میں لڑائی اور قتل و غارت گری کا سکہ چل رہا ہے۔ اگر چاکروں کی حکومت ہوتی اور وہ مضبوط اور طاقت ور ہوتی تو اشاری سر نہ اٹھاتے۔ اب کچھ قبیلے اشاریوں کے ساتھ ہیں اور کچھ چاکروں کے ساتھ۔ اس طرح سارا بلوچستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ نہ کوئی بادشاہ ہے اور نہ کوئی رعایا" بی برگ نے سیدھی سادی بات کی

"چاکروں کی حکومت کے لیے ہی تو ہم لڑ رہے ہیں۔ اگر آج گواہرام خان اشاری کو شکست ہو جائے تو سارے بلوچستان پر چاکر قبیلے کا راج ہوگا" چاکر خاں نے کہا۔

"یہ بات تو ٹھیک ہے" بی برگ بولا اور قہوے کا خالی پیالہ خادم کو پکڑا کر سیب کی شاخ سے بندھا گھوڑا کھولنے لگا تاکہ اس پر سوار ہو کر وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بتائے کہ آج لڑائی کا خطرہ نہیں۔ بابا نودبندغ صلح کی بات کر رہا ہے۔

۔۔۔۔ کے میدان کے کنارے پر پہاڑی کے درمیان ایک آبشار کے پاس بی بی بطنی کا خیمہ تھا جسے گدان کہا جاتا تھا۔ گدان دراصل وہ خیمہ ہوتا ہے جو اونٹ کے بالوں سے تیار کئے ہوئے کمبلوں سے بنایا گیا ہو۔ بی بی بطنی کے گدان میں وہ تھی اور اس کے دو بیٹے جدگال اور جلدال تھے۔ جدگال کی عمر بارہ سال تھی اور جلدال کی عمر دس سال۔ دونوں سانولے رنگ کے صحت مند بچے تھے۔ وہ اپنی دادی 'بی بی بطنی' کے دائیں بائیں بیٹھے گائے کے دودھ میں مکئی کی روٹی بھگو بھگو کر کھا رہے تھے۔ بی بی بطنی کی عمر ستر سال کے قریب تھی اور اس کے سر کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ "دادی! میرے باپ کا نام کیا تھا؟" جدگال نے اچانک پوچھا۔

"کئی بار بتایا ہے اس کا نام کیبریط تھا اور وہ سردار چاکر خاں کا ساتھی تھا۔ اس کے لیے لڑتا ہوا پانچ سال پہلے مارا گیا"۔

"اور میرے باپ کا نام کیا تھا دادی؟" جلدال نے پوچھا جو جدگال سے دو سال چھوٹا تھا۔

"تیرے باپ کا نام تھا شیریط اور وہ سردار گواہرام خاں کا ساتھی تھا اور اس کے لیے لڑتا ہوا چار سال پہلے مارا گیا"

"میری ماں اور میری چچی کہاں گئیں"؟ جدگال نے سوال کیا۔

"جاناں لباں تھا وہ تو اپنے اپنے خاوند کو بچانے کے لیے لڑائی کے میدان میں کود پڑیں اور دشمن کے گھوڑوں کے سموں تلے کچلی

تھیں" دادی نے بتایا۔

"اس وقت ہم کہاں تھے" جگدال نے سوال کیا۔

"تم میرے پاس تھے۔ دونوں کو لے کر میں چاکر خاں کے قلعہ میں چلی گئی تھی" دادی بولی

"قلعہ کے دربان نے آپ کو اندر جانے دیا۔ کیوں؟" جدگال نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ دربان مجھے جانتا تھا"

"کیسے جانتا تھا؟ کیوں جانتا تھا؟" دونوں نے باری باری پوچھا

"وہ یوں جانتا تھا کہ یہ جو 30 سال سے لڑائی لڑی جا رہی ہے اس کی وجہ میں ہوں۔ میری وجہ سے ہی یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے" دادی بولی۔

جدگال اور جگدال نے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور پھر جگدال نے پوچھا "دادی جان کھل کر صاف صاف بتاؤ"

"بیٹو! یہ پرانی بات ہے۔ 30 سال بہت ہوتے ہیں۔ میری عمر اس وقت 40 سال ہوگی۔ یہ جو سامنے میدان ہے یہاں ہر سال گھڑسوار شہ سواری کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ گھڑدوڑ کھلی ہوتی تھی یعنی جو چاہے اس میں حصہ لے سکتا تھا۔ ہم تب سردار چاکر خاں رند کی رعایا تھے اور اس کی زمینوں پر رہتے تھے اور بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالتے تھے۔

ایک اور بات بتا دوں۔ ہم بلوچ نہیں ہیں۔ یعنی تم دونوں بلوچ نہیں ہو جاٹ ہو۔ تمہارے بزرگ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ پھر وہ وہاں سے بلوچستان آگئے اور گلہ بانی کرنے لگے۔ عربی زبان میں جاٹ کو زط کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میرا نام زطنی بی بی ہے۔ ہارون الرشید کے زمانے میں اس نے جاٹوں کے بچوں اور بوڑھوں کو قتل کیا اور جو لڑنے والے جاٹ تھے انہیں بصرہ بھیج دیا۔ یہ پنجاب کے جاٹ تھے۔ ہاں وہ جو یونان کا ایک بہت مشہور بادشاہ ہوا ہے سکندر اعظم، وہ جب ایران میں لڑنے کے لیے آیا تو اس کا مقابلہ پنجاب کے جاٹوں سے ہوا تھا۔ یہ جاٹ ایران کے شہنشاہ کی فوج میں بھرتی ہو چکے تھے اور انہوں نے یونانی سپاہیوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور پھر سکندر اعظم ان سپاہیوں کو سزا دینے کے لیے پنجاب پر حملہ آور ہوا اور بیاس دریا تک پہنچا"۔

"واقعی دادی ایسا ہوا؟" جدگال نے پوچھا

"مجھے پتا نہیں۔ میں نے تو یہ بات میر چاکر خاں رند کی بیگم حانی سے سنی تھی۔ میں حانی کے بال گوندھنے کے لیے جاتی تھی۔ ایک بار اس نے مجھے سکندر اعظم اور پنجاب والی بات سنائی تھی"

"دادی! آج پھر سردار چاکر اور سردار گواہرام کے لشکری گھوڑوں پر سوار ہیں اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں" جگدال بولا

"پچھلے 30 سال سے یہی ہو رہا ہے۔ میں تو قتل و غارت گری دیکھ دیکھ کر بہت دکھیا ہو گئی ہوں۔ سمجھ نہیں آتی یہ صلح کیوں نہیں کرتے۔ چاکر خاں اور گواہرام خاں ایک دوسرے کو سردار مان لیں تو بات ختم ہو جائے۔ اب دونوں ایک دوسرے کو سردار ماننے سے انکار کرتے ہیں حالانکہ دونوں سردار ہیں۔ چاکر خاں ذرا بڑا سردار ہے۔ ایک تو اس کے پاس سبی کا قلعہ ہے دوسرے قندھار والے بھی اس کی بات مانتے ہیں۔ اس کے پاس لڑنے مرنے والے بہادر بھی زیادہ ہیں" زطنی بی بی نے کہا۔

"سردار چاکر کے بہادر تو مر کھپ گئے" جدگال بولا

"اسی طرح گواہرام خاں کے بہادر سپوت بھی تلوار کے گھاٹ اتر گئے" جگدال نے کہا۔

"بلوچوں کا بہت نقصان ہوا۔ بلوچوں کے علاوہ غیر بلوچوں کا بھی بہت نقصان ہوا۔ تم دونوں کے باپ نصیر بیگ اور بشیر بیگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھلا ان کا کیا قصور تھا؟ ان کی بیویوں کا کیا قصور تھا؟ ان کو بلاوجہ چاکر اور رامشار قبیلے کا ساتھ دینا پڑا۔ بلاوجہ" زطنی بی بی روہانسی آواز میں بولی

"دادی! کبھی سوچا یہ لڑائی کیسے ختم ہو سکتی ہے؟" جدگال نے سوال کیا۔

آنکھوں سے آنسو پونچھ کر دادی بولی "کئی بار سوچا ہے۔ یہ لڑائی تب ختم ہوگی جب سردار چاکر خاں مارا جائے گا اور گواہرام خاں کی جیت ہوگی یا جب گواہرام خاں مارا جائے گا اور چاکر خاں کی جیت ہوگی۔ یا جب دونوں لڑائی میں مارے جائیں گے اور دونوں قبیلوں کے جنگجو سردار نہ رہیں گے۔ یا جب کوئی سید زادہ دونوں سے کہے گا کہ لڑائی ختم کرو۔ لیکن سارے بلوچستان میں اب کوئی بھی سید زادہ نہیں رہا۔ سبھی سندھ اور پنجاب کی طرف جا چکے

ہیں۔ یا پھر بچے ان دونوں سرداروں سے جاکر درخواست کریں کہ لڑائی بند کر دو"۔

"تو کیا پھر لڑائی بند کر دیں گے"؟ جدگال نے سوال کیا۔

"ہاں بند کر دیں گے۔ یا پھر عورت جاکر کہے کہ لڑائی بند کر دو تو وہ بند کر دیں گے۔ بلوچ سید' عورت اور بچے کا کہا مانتے ہیں۔ یہ ان کی روایت ہے" دادی نے کہا

"اگر یہ بات ہے تو دادی آپ چاکر خاں اور گواہرام خاں سے جاکر کہیں کہ وہ لڑائی بند کر دیں" جگدال نے کہا

"میں نہیں کہہ سکتی کیوں کہ میری وجہ سے تو لڑائی شروع ہوئی تھی" دادی بولی

"کیسے شروع ہوئی؟ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں" جدگال بولا

"جب میری عمر 40 سال تھی تو چاکروں کی زمین پر شہ سواری کا مقابلہ ہوا تھا۔ اس گھڑ دوڑ میں چاکر اور لاشاری نوجوانوں نے حصہ لیا۔ چاکر شہ سوار جیت گئے' لاشاری ہار گئے اور جب دونوں قبیلوں کے نوجوان شام کو واپس گھروں کو جا رہے تھے تو ان میں سے کچھ لاشاری نوجوان غصے میں تھے۔ انہوں نے جاتے ہوئے ہماری اونٹنیوں کے تھن کاٹ دیے۔ وہ بلبلانے لگیں۔ ان کو دیکھ کر میرا برا حال ہو گیا۔ میں اسی وقت بھاگ کر سبی کے قلعہ میں گئی اور میر چاکر خاں رند سے فریاد کی کہ لاشاری نوجوانوں نے غصے میں آکر میری اونٹنیوں کو زخمی کر دیا ہے۔ وہ یہ سمجھے یہ اونٹنیاں میر چاکر خاں رند کی ہیں' بی بی بطنی کی نہیں ہیں"۔

"پھر کیا ہوا؟" جدگال نے پوچھا

"ہونا کیا تھا۔ سردار نے حکم دیا کہ جن نوجوانوں نے بی بی بطنی کی اونٹنیوں کو زخمی کیا ہے ان کے تھن کاٹے ہیں ان کو سزا دی جائے۔ اگلے دن لڑائی شروع ہو گئی جو اب تک جاری ہے اور ختم ہونے کا نام نہیں لیتی" بی بی بطنی نے یہ کہہ کر ٹھنڈی آہ بھری

جدگال اور جگدال نے دادی کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے دیکھے تو گھر ان سے اٹھ کر باہر آ گئے۔ انہوں نے دیکھا گھڑ سوار اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ وہ تیر کمانوں' تلواروں اور ڈھالوں سے لیس ہیں۔ کچھ لشکریوں کے پاس نیزے بھی ہیں۔ لڑائی کی پوری تیاری تھی۔ 30 سال سے یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے' مرتے اور مارتے تھے اور پھر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ تاکہ لڑائی میں کام آنے والوں کو دفن کریں اور زخمیوں کے زخموں پر مرہم لگائیں۔ جب وہ صحت یاب ہو جائیں تو لڑنے مرنے کے لیے ایک بار پھر میدان میں ہتھیار بند ہو کر آ جائیں۔ یہ فضول جنگ تھی کیوں کہ یہ کفر اور اسلام کی جنگ نہ تھی۔ یہ تو قبائلی جنگ تھی جو صرف اقتدار کے لیے لڑی جا رہی تھی اور جس میں بے گناہ انسانوں کا نقصان ہو رہا تھا۔

نودبندغ نے واپس جاکر اپنے بیٹے گواہرام خاں لاشاری سے کہا "سردار چاکر وضع دار سردار ہے۔ اس نے میری عزت کی اور میری بات مانی۔ وہ صلح کے لیے تیار ہے۔ صرف یہ چاہتا ہے کہ گواہرام یعنی تو اسے سردار تسلیم کر لے"۔

"بابا یہی تو وہ جھگڑا ہے جس کے لیے پچھلے 30 سال سے جنگ لڑی جا رہی ہے۔ میں اسے بلوچستان کا سردار تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اپنے رند قبیلے کا سردار ہے اور میں لاشار قبیلے کا سردار ہوں۔ پہلے اس قبیلے کے سردار آپ تھے پھر آپ نے سرداری مجھے عطا کی" گواہرام خاں بولا

"لیکن یہ جھگڑا نہیں ہے۔ جھگڑا تو یہ ہے کہ لاشاری نوجوانوں نے بی بی بطنی کی اونٹنیوں کو گھڑ دوڑ کے دن زخمی کیا تھا اور چاکر خاں نے ان نوجوانوں کو سزا دینا چاہی تھی جس پر لڑائی شروع ہوئی" نودبندغ نے گواہرام کی بات ماننے سے انکار کیا

"اصل جھگڑا سرداری کا ہے لاشاری نوجوانوں کو سزا دینا تو صرف ایک بہانہ تھا"۔

"اگر بہانہ بھی تھا تو وہ نوجوان ختم ہو گئے' اونٹنیاں ختم ہو گئیں۔ بی بی بطنی کے دو بیٹے کیبریط اور بشیریط لڑائی میں مارے گئے۔ وہ خود لاچار ہو گئی۔ اب دو پوتوں کو لے کر موت کے کنارے بیٹھی ہے۔ اس نے شکایت کر کے کیا پایا۔ وہ تو پچھتا رہی ہو گی" نودبندغ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"بابا جان' آپ بوڑھے ہو گئے ہیں اس لیے امن اور صلح کی بات کرتے ہیں۔ یہ لڑائی ہماری غیرت کا امتحان ہے اور اس امتحان میں ہم پورے اتریں گے" گواہرام خاں نے جوش سے کہا

"یہ غیرت کی بات نہیں ہے' بے وقوفی کی بات ہے کہ

ہزاروں عورتیں اور مرد مر چکے ہیں۔ ایک نسل ختم ہو گئی اور اب دوسری نسل لڑ رہی ہے اور یہی حال رہا تو شاید تیسری نسل کو بھی لڑنا پڑے"۔

"ضرورت پڑی تو تیسری نسل بھی لڑے گی" گواہرام خاں لاشاری بولا۔

"تیسری نسل ہو گی تو لڑے گی۔ اگر ہوئی بھی تو یہ لڑائی اسے ختم کر دے گی" نودبندغ نے کہا۔

"آپ کچھ بھی کہیں یہ لڑائی ختم نہیں ہو گی" گواہرام نے کہا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اپنے جوانوں کی صفیں درست کرنے کے لیے چل پڑا۔

وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس کا راستہ روکے بی بی بطنی اور اس کے دو پوتے کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے بی بی بطنی؟" گواہرام نے گھوڑا کھڑا کر کے پوچھا۔

"میرے دو معصوم پوتے آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں" بی بی بطنی بولی

"کہئے کیا بات ہے بچو" گواہرام نے کہا

"ہم حاضر ہوئے ہیں یہ عرض کرنے کہ آپ لڑائی بند کر دیں" جدگال بولا

گواہرام تو سناٹے میں آ گیا۔ اسے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ ایک معصوم بچہ یہ مطالبہ کرے گا۔ وہ چپ ہو گیا۔ لگتا تھا الفاظ اس کی زبان کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

"آپ چپ ہو گئے ہیں۔ بولتے کیوں نہیں؟ کچھ تو کہئے؟" بی بی بطنی بولی

"ہم بلوچ معصوم بچوں کی بات نہیں ٹال سکتے۔ یہ ہماری روایت ہے۔ میں تیرے پوتوں کی بات مانتا ہوں بی بی بطنی" گواہرام نے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے گھڑ سواروں سے کہا کہ وہ واپس چلے جائیں۔ اس کے بعد وہ خود اپنے باپ نودبندغ کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہی کچھ چاکر خاں رند کے ساتھ پیش آیا۔ وہ بھی بی بی بطنی کے دو پوتوں جدگال اور جگدال کی بات نہ ٹال سکا۔

دوسرے دن میر چاکر اپنے بچے کھچے قبیلے کو لے کر پنجاب کی طرف روانہ ہوا اور جب وہ فوت ہوا تو اس کا مقبرہ ساہی وال کے ایک گاؤں ست گرہ میں بنایا گیا۔

سردار گواہرام خاں نے ایک ہفتہ بعد سندھ کا رخ کیا۔ البتہ نودبندغ نے بلوچستان نہ چھوڑا۔ اس نے اپنی باقی زندگی ایک مسجد میں خدا کی یاد میں گزار دی۔ یہ تھی دو بچوں کی فتح جو دراصل عقل کی فتح تھی!

☆ ☆ ☆

بلاعنوان

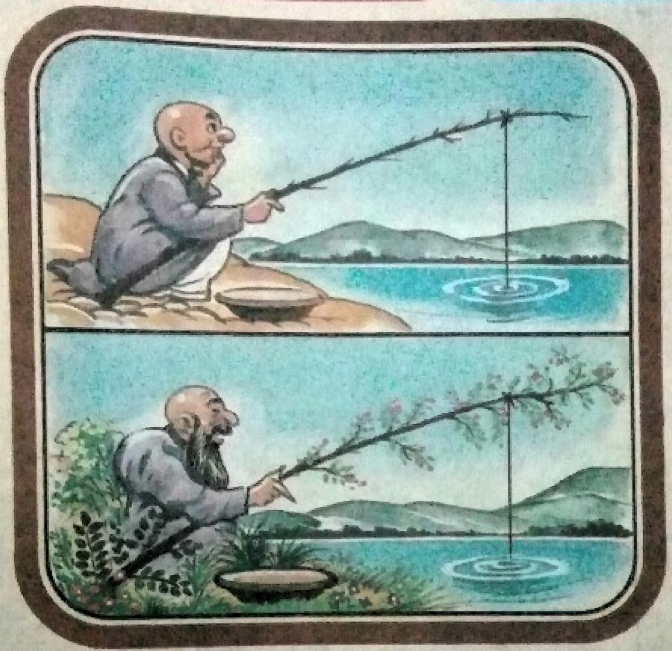

☆ اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 250 روپے کی کتابیں لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 نومبر

اکتوبر 97ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو تین عنوان: اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ' بڑے مصروف چھوٹا مشغول' ہم بھی کسی سے کم نہیں' پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کیے ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی یہ تین ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

○ رابعہ نسیم راولپنڈی (اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ' پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)
○ محمد علی فاروقی ساہیوال (بڑے مصروف چھوٹا مشغول' دوسرا انعام 80 روپے کی کتابیں)
○ محمد فیصل خانزادہ حیدرآباد (ہم بھی کسی سے کم نہیں' تیسرا انعام 70 روپے کی کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00